www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/15 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مئی 2025

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

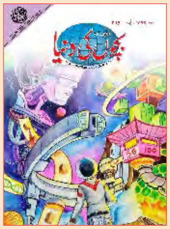

ان کے علاوہ:

- کہکشاں
- زبان شناسی
- میرا بچپن
- بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ
- ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل	مدیر	4

شخصیات

قمر جمالی کی غیر افسانوی کائنات	سید فریاد بی	5
عنبر عابد کی شاعری	سلیم انصاری	10

رنگ فکشن

جوگندر پال کے افسانوں میں نسوانی کردار	زمیلہ بیگم	14
اختر اور ینوی: بحیثیت افسانہ نگار	تبسم آرا	18

تاریخ و صحافت

بہار میں ادبی تاریخ نویسی	شگفتہ پروین	22
اردو صحافت میں کالم نویسی کی اہمیت	ثوبیہ رفیق	27

جہان سائنس

سائنس کے میدان میں ہندوستانی خواتین کا کردار	محمد اکمل خان	31

جہان نسواں

پروفیسر مہدی حسین ناصری: حیات اور ادبی خدمات	افزا خاتون	36
'رات کا دوسرا کنارا': انسانی رویوں کا آئینہ دار	ام سلمہ	39
اردو کے تحفظ میں وانیمباڑی کے تعلیمی اداروں کا کردار	کے۔ نادرہ بیگم	43

حسن سخن

سیدہ تبسم ناڈکر، جبیں نازاں، فرحانہ نازنین		47

افسانے

غبار	زیبا ناز	49
سنیں دل کی	نازنین فردوس	54

ارتباط

مباحثہ/ قارئین کے خطوط		60

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 9 شمارہ: 5 مئی 2025

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65

نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-49539000

شعبۂ ادارت: 011-49539009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

وکست بھارت کے وژن 2047 کے تحت حکومت کی جانب سے ایک طرف جہاں ملک کے نوجوانوں، کسانوں اور غریبوں پر توجہ دی جارہی ہے وہیں خواتین بھی اس ذیل میں خصوصی طور پر شامل ہیں۔ مستقبل کے تعلق سے جس طرح بھارتیہ نوجوانوں سے امیدیں وابستہ ہیں خواتین کی خدمات بھی اس تناظر میں نہایت اہم ہیں۔ بھارت سرکار نے وکست بھارت کے حوالے سے خواتین کی شراکت کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی شمولیت کے بغیر وکست بھارت کا تصور ناممکن ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں تقریباً پچاس فیصد خواتین ہیں۔ لہٰذا اس طور سے بھی وکست بھارت کے نظریے سے ان کی شمولیت بہت اہم ہوجاتی ہے۔

ایک زمانے تک زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کے حقوق تلف ہوتے رہے۔ تعلیمی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی طور پر انھیں وہ اختیارات نہ مل سکے جو ان کے گھر کے مردوں کو ملے۔ اس سلسلے میں ان کی کوششوں اور محنتوں کو بھی نظرانداز کیا گیا۔ انسانی زندگی کے اس رویے نے انھیں سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی الغرض اس نوع کے مختلف میدانوں سے دور رکھا۔ لیکن موجودہ دور میں خواتین نئی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی ہیں۔ خواتین اب صرف خاتون خانہ نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اپنا تعاون پیش کررہی ہیں۔

بھارت سرکار نے بھی وکست بھارت وژن کے تحت خواتین کا ذکر اسی سیاق میں کیا ہے۔ حکومت خصوصی طور پر مستقل وومن امپاورمنٹ کا ذکر کررہی ہے۔ وزیر خزانہ نے اپنے 25-2024 کے بجٹ سیشن میں یہ بات کہی ہے کہ 'صنعت کاری کے ذریعے خواتین کو اختیار عطا کرنے، زندگی بسر کرنے میں آسانی پیدا کرنے اور انھیں باوقار اور خودمختار و باحیثیت بنانے کے اقدامات تیز تر ہوئے ہیں'۔ اسی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم میں خواتین کی شمولیت 28 فیصد تک بڑھ گئی ہے۔ اسی طرح لوک سبھا اور ودھان سبھا میں خواتین کے لیے ایک تہائی سیٹیں محفوظ کی گئی ہیں۔ پسماندہ اور دیہی قصبوں میں پی ایم آواس یوجنا کے تحت ستر فیصد سے زائد مکانات مشترکہ یا انفرادی طور پر خواتین کے حصے میں آئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مدرا یوجنا قرض کے تحت تیس کروڑ کی خطیر رقم ان خواتین کو دی گئی ہے جو کاروبار سے منسلک ہیں۔ بھارتیہ حکومت کے ان اقدامات اور خواتین کے حقوق و مراعات کو 'ناری شکتی' نعرے کی روشنی میں دیکھا جارہا ہے۔ عزت مآب وزیراعظم جناب نریندر مودی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ معتدل قانون سازی کے لیے ناری شکتی وندن ادھینیم ایک مثال ہے اور اس کے ذریعے خواتین کے احترام کو تقویت ملے گی'۔ بھارتیہ حکومت کے ان فیصلوں اور اقدامات کو دیکھا جائے تو بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نسواں کی نئی تعمیر و تشکیل اور ترقی کے لیے کس قدر حساس و فعال ہے اور اس سلسلے میں کیا کچھ کوششیں کررہی ہے۔

آپ کا

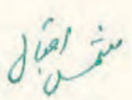

سیدفریادبی

قمر جمالی کی غیر افسانوی کائنات

قمر جمالی حیدر آباد کے ان گنے چنے ادیبوں میں شمار ہوتی ہیں جنھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گیسوئے اردو کو سنوارنے میں لگا دیا۔ ان کے ادبی سرمایے میں افسانوی اور غیر افسانوی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ اظہار کی بے چینی انھیں خاموش رہنے نہیں دیتی۔ انھوں نے غیر افسانوی نثر کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔قمر جمالی نے غیر افسانوی نثر کی ابتدا تبصروں سے کی۔انھوں نے کل 37 تبصرے تحریر کیے ہیں۔مختلف تصانیف پر جو تبصرے لکھے ان میں سے اکثر مختلف موقر رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ان کے ان تبصروں اور دیباچوں کا مجموعہ 'انعکاس' 2012 میں اردو اکادمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔اس میں اگرچہ وہ تبصرے شامل ہیں جو پہلے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھےلیکن ان تبصروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو انھوں نے کتابوں کے رسم اجرا کے موقع پر پڑھے ہیں اور چند تبصرے ایسے بھی ہیں جو ان کی ذاتی بیاض میں موجود ہیں لیکن ان کے متعلق کوئی جانکاری نہیں ہے کہ وہ کہاں سے شائع ہوئے بلکہ ان کے صرف چند مسوّدے مل رہے ہیں۔ان میں سے چند تبصرے مندرجہ ذیل ہیں: مرزا دبیر نمبر، بعنوان مرزا دبیر نمبر مجموعہ مقالات ماہنامہ آندھرا پردیش، حیدر آباد، دسمبر 1997۔آخری پودا، بعنوان 'آخری پودا-ایک تجزیہ' اجرا پر پڑھا گیا، 22 جنوری 2011۔ بعنوان 'جنھیں میں نے دیکھا جنھیں میں نے جانا ایک اجمالی جائزہ' ششماہی 'بیسویں صدی'، افسانہ نمبر اگست 2022 وغیرہ۔

قمر جمالی کے مطالعے میں گہرائی، فکر میں وسعت اور خیالات میں رفعت ہے۔جب وہ کسی کتاب پر تبصرہ لکھتی ہیں تو اس میں شامل جزئیات نگاری کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں۔صرف فہرست کو دیکھ کر اور سرسری تعارف و توصیف سے کام نہیں لیتیں۔ان کا خیال ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد (React) کرنا چاہیے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی جس کا وہ اپنی عملی زندگی میں بھی استعمال کرتی ہیں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی قول و فعل کی سچی اور صداقت پسند مصنفہ ہیں۔ جب کبھی کوئی بات قمر جمالی کو نامناسب اور غیر متوقع محسوس ہوتی ہے تو وہ اس خامی کی نشاندہی کرتی ہیں اور دوٹوک الفاظ میں قلمبند کرتی ہیں۔کبھی کوئی تحریر اگر صنف کے اعتبار سے اجزائے ترکیبی پر کھری نہیں اترتی تو اس کی طرف بھی واضح اشارہ کرتی ہیں اور

وہ کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بڑی وضاحت سے کام لیتی ہیں۔اعتدال وتوازن ان کے تبصروں کی اہم خصوصیت ہے۔قمر جمالی کے تبصروں میں زیر بحث تصانیف کا ادبی، تحقیقی وتنقیدی اور اسلوبیاتی ہر لحاظ سے جائزہ لیتی ہیں۔ان کے تبصروں میں بے لاگ رائے ہوتی ہے۔قمر جمالی کی تحریروں کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ آغاز کو بڑی اہمیت دیتی ہیں کبھی آیات قرآنی، کبھی احادیث ،کبھی حکایتیں، کبھی اقوال زریں ،کبھی فارسی کلام سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے فنی نکتہ دانیوں سے شخصیت کی پرتیں کھولتی ہیں، مصنف اوراس کی تخلیق کا جائزہ لیتی ہیں۔

”قمر جمالی کے تبصروں کے مطالعے سے ان کی زبان وبیان پر قدرت کا بھی پتہ چلتا ھے۔ ان کا میدان عمل محدود نہیں ھے۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتی ھیں۔ وہ فارسی، عربی اور انگریزی ادب سے الفاظ وتراکیب لے کران کا اردو میں استعمال کرتی ھیں۔“

قمر جمالی کے تبصروں کے مطالعے سے ان کی زبان وبیان پر قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان کا میدان عمل محدود نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتی ہیں۔وہ فارسی، عربی اور انگریزی ادب سے الفاظ وتراکیب لے کران کا اردو میں استعمال کرتی ہیں۔قمر جمالی ایک کامیاب تبصرہ نگار ہیں۔انھوں نے اپنے قلم سے قاری کے سامنے جواہر پارے پیش کیے ہیں۔ان کے تبصروں کا بنیادی وصف ان کا منفرد اسلوب اور طرزِ تحریر ہے۔ان کے طرزِ بیان میں شائستگی ،سنجیدگی ،متانت اور صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کے پاس قوت فیصلہ بھی مضبوط ہے۔وہ فنی تقاضوں سے آگہی بھی رکھتی ہیں۔

قمر جمالی نے انشائیہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے لیکن ان کے کل آٹھ انشائیے ہی دستیاب ہوئے ہیں۔ان میں دو غیر مطبوعہ ہیں۔ان کا پہلا انشائیہ ’اے وحشت دل کیا کروں‘ 25 دسمبر 1990 کو روز نامہ ’’سیاست‘‘ میں شائع ہوا۔دوسرا انشائیہ ’لمحوں کے جھروکے سے‘ 1998، تیسرا انشائیہ ’محشر بپا کرے گی یہ پیاز کی ڈلی‘ 1999 وغیرہ۔انھوں نے اپنے انشائیوں میں عصرِ حاضر کے اہم مسائل کو پیش کیا ہے۔قمر جمالی نے انسانی اور معاشرتی زندگی کے پیچ وخم کو اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے۔ان کے انشائیوں میں طنز کا نشتر بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی ۔ وہ جس مسئلے کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتی ہیں بغیر کسی تلخی کے مسائل تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔قمر جمالی کی انشائیہ نگاری میں جن چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے وہ بزلہ سنجی ، حاضر جوابی اور شگفتہ بیانی ہے۔قمر جمالی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی مضمون کو بھی نہایت دلکش اور مؤثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کی زبان سادہ، شگفتہ اور شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ان کے انشائیوں میں جو جدت اور شوخی ہے وہ ان کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔ان کے انشائیے صرف تبسم نہیں بلکہ تفکر کی دعوت بھی دیتے نظر آتے ہیں۔چنانچہ ان کے انشائیے صنف انشائیہ نگاری میں اہمیت کے حامل ہیں۔

قمر جمالی نے تبصرہ نگاری ، انشائیہ نگاری کے علاوہ مضمون نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ان کے مضامین مختلف اردو اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ان کے مضامین کا مجموعہ بعنوان ’نواحِ ادب‘ کے نام سے 2016 میں منظر عام پر آچکا ہے۔انھوں نے جتنے مضامین لکھے ہیں ان کی نوعیت تحقیقی وتنقیدی، شخصی اور تعارفی ہے۔تصوف کے موضوع پر لکھے گئے تحقیقی مضامین میں فارسی کے چند اہم صوفیوں کی شخصیت وسیرت اور ترک دنیا، مشائخوں کی خدمت محبت اور ان کی قوت روحانی وکرامات پر روشنی ڈالی ہے۔یہ مضامین ان کے وسیع مطالعے اور غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ مختلف حکایات وروایات کی روشنی میں مختلف مذہبی کتابوں سے دلائل پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔قمر جمالی کی تحریروں میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے۔تحقیقی مضامین کی زبان اور اقدار میں سادگی الفاظ اور موضوع کی خوبصورتی نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنے مضامین میں

ایک ایک چیز کو باریکی سے سوچتے ہوئے ہر چیز کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ادب دوست شخصیات پر لکھے گئے مضامین موضوع کی وضاحت کے ساتھ ساتھ دکن کی تاریخی وتہذیبی فضا کو جابجا اجاگر کرتے ہیں۔ بعض مضامین میں انھوں نے اتنی لمبی تمہید باندھی ہے کہ جس سے قاری کہیں گم ہونے لگتا ہے مگر وہ اپنے لطیف اندازِ بیان سے قاری کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ان کے بعض مضامین میں عالمانہ خیالات کا اظہار بھی ہے اورانھوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنی بات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"قمر جمالی جو بھی منظر دیکھتی ہیں وہ جذب کر لیتی ہیں اور اس طرح خود بھی منظر کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔خصوصاً واقعات ومناظر کی مستی ان پر طاری ہو جاتی ہے۔"

قمر جمالی جو بھی منظر دیکھتی ہیں وہ جذب کر لیتی ہیں اور اس طرح خود بھی منظر کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔خصوصاً واقعات ومناظر کی مستی ان پر طاری ہوجاتی ہے۔غرض شگفتہ اور پُرلطف نثر،سفر کی روداد، سیاسی،سماجی،تہذیبی وتاریخی حالات کی عکاسی ، وہاں کی زبان کی خصوصیات اور دلکش منظر نگاری ، واقعہ نگاری ،جذبات نگاری کے مطالعے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک اچھی سفرنامہ نگار ہیں۔

ان کے افسانے سماج اور باہر کے ماحول سے زیادہ گھر کی چار دیواری میں بند کمرے کی فضا کو ہی پیش کرتے ہیں۔شخصیات پر لکھے گئے مضامین میں مصنف کی شاعری ،افسانہ نگاری وغیرہ کا تجزیہ کرتے وقت اپنی تنقیدی رائے کا اظہار بھی کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معروضی نقطۂ نظر رکھتی ہیں اور متوازن ومدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔قمر جمالی کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی ندرتِ فکر ہے۔قاری جب کوئی مضمون پڑھتے ہوئے اس کے موضوع پر آتا ہے تو وہ اپنے طور پر جس چیز کا خیال کرتا ہے اس سے بالکل الگ نئے خیال اور نئے پہلو سے ہم کنار ہوتا ہے۔اس طرح غیر متوقع خیالات اس کی دلچسپی کو بڑھاتے ہیں۔الغرض ان کے تمام مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادیت رکھتے ہیں۔تحقیق وتنقید کے لیے جس جرأت مندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ قمر جمالی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تلاش وجستجو صاف گوئی ، بے باکی ،حق گوئی ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا نمایاں وصف ہیں۔

قمر جمالی تبصرہ نگار،انشائیہ نگار اور مضمون نگار کے علاوہ ایک کامیاب سفر نامہ نگار بھی ہیں۔انھوں نے تین سفر نامے تحریر کئے ہیں۔ان کا پہلا سفر نامہ 'شاخ نبات' 1992 ،دوسرا سفر نامہ 'آخری تکون' 2007 ،اور تیسرا سفر نامہ 'اتکل کلنگا اڑیسہ' 2015۔ان کے یہ تینوں سفر نامے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر نامے کسی ادبی سمینار وکانفرنس میں شرکت کی غرض سے کیے گئے اسفار پر مشتمل ہیں۔قمر جمالی اپنے سفر ناموں میں سیاسی ،سماجی ،تہذیبی ،تاریخی ،جغرافیائی، مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو نہ صرف بغور دیکھا بلکہ نہایت خوبی کے ساتھ اپنے سفر ناموں میں سمیٹ لیا ہے۔ان کے اسلوب میں روانی ہے۔ان کا خطابیہ انداز اور تکرارِ الفاظ میں داخلی حسن ہے اور یہ اسلوب قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ قمر جمالی کی تحریر کا انداز فطری، دلآویزی اور بعض جگہ مکالماتی ہے۔ان کے سفر ناموں کی ایک جداگانہ اہمیت اور حیثیت اس لیے بھی ہے کہ مصنفہ نے مروجہ روش سے ہٹ کر اسے تحریر کیا ہے۔یہ سفر نامے قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہیں۔چونکہ قدیم سفر ناموں کی طرح تاریخ کو زیادہ اہمیت دی ہے اور جدید سفر ناموں کی طرح اس میں ایک سچی سیاحت ،مخصوص مشاہدات اور فلسفۂ زندگی ہے۔اس میں سفرِ حیات کے تجربات ومشاہدات کے عکس کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ منظر نگاری ہے۔قمر جمالی کی کامیابی کا راز ان کی منظر نگاری میں پوشیدہ ہے۔سفر ناموں میں اول تا آخر منظر نگاری کو جس خوبی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا وہ قابل ستائش ہے۔ ان کی منظر کشی ایک طرف ادبیت کی چاشنی سے پر ہے تو دوسری طرف چند سطروں میں مرقع کھینچ کر رکھ دیتی ہے۔سفر نامہ 'شاخِ نبات' میں انھوں نے گوا کی تمام گھاٹیوں اور وادیوں کے

مناظر کو بڑے ہی دلچسپ وشگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔

قمر جمالی نے وفاتیہ کی طرف بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ انھوں نے کل دس وفیات تحریر کیے ہیں۔ جس کسی بھی مرحوم پر وفاتیہ لکھا ہے اس میں خلوص ومحبت کے ساتھ غم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات ، کیفیات وتاثرات کا اظہار نہایت ہی پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سے قاری کا دل بھی درد وغم سے بھر جاتا ہے۔ 'یادِ عظمت' اور 'اے راحتِ جاں'، اس ذیل میں نہایت ہی اہم ہیں۔ کیونکہ قمر جمالی، عظمت صاحبہ کو اپنی ماں تصور کرتی ہیں۔ اپنی بہن ساجدہ سلطانہ ان دونوں بہنوں اور ماں بیٹی کا رشتہ جذباتیت پر مشتمل ہے، جس میں پائی جانے والی محبت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ سہل اسلوب اور وسیع الفہم تعبیر کے ذریعے ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ حیات وخدمات اور احوال وآثار کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قمر جمالی کے لکھے گئے وفاتیوں میں شخصیتوں کی محبت، عقیدت والفت کی جلوہ گری نے مندرجات کو خشک وسپاٹ ہونے سے بچالیا۔ الغرض قمر جمالی نے ایسی شخصیات کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے جو اپنی بیش بہا علمی، ادبی، سیاسی، سماجی دنیا سے جڑے ادب دوست رہے ہیں۔

"قمر جمالی نے صنف خاکہ نگاری میں بھی اپنے قلم کو آزمایا ہے۔ ان کی ذاتی بیاض میں کل سترہ خاکے شامل ہیں۔ان میں بعض خاکوں کو انھوں نے ترمیم کرتے ہوئے شخصی مضامین میں شامل کیا ہے اور بعض خاکوں کے سنِ اشاعت کا مجھے علم نہیں ہے۔ان کے بعض خاکے کتابوں کی رسم اجرا پر پڑھے گئے ہیں اور کسی ادبی رسالے یا اخبار میں شائع ہوچکے ہیں۔"

قمر جمالی نے صنف خاکہ نگاری میں بھی اپنے قلم کو آزمایا ہے۔ ان کی ذاتی بیاض میں کل سترہ خاکے شامل ہیں۔ ان میں بعض خاکوں کو انھوں نے ترمیم کرتے ہوئے شخصی مضامین میں شامل کیا ہے اور بعض خاکوں کے سنِ اشاعت کا مجھے علم نہیں ہے۔ ان کے بعض خاکے کتابوں کی رسم اجرا پر پڑھے گئے ہیں اور کسی ادبی رسالے یا اخبار میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے لکھے گئے خاکے بڑے متوازن اور متناسب ہیں۔ ان کے خاکوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خاکہ نگاری کے تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ زبان وبیان پر انھیں بھرپور قدرت حاصل ہے۔ قمر جمالی نے کسی فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت سے متعلق چند انوکھے پہلوؤں کو اس فن کاری سے بیان کیا ہے کہ اس شخص کی زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور ذہن پر اس کا نقش قائم ہوجاتا ہے۔ قمر جمالی نے اپنے خاکوں میں کرداروں کی اس طرح مرقع کشی کی ہے کہ ان سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور خاکہ نگار سے نہ صرف انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے کہ بلکہ قاری کے دل میں انسانیت کا احساس بھی موجزن ہوجاتا ہے۔ قمر جمالی کے یہاں اوّلین اہمیت انسان کی ہے اور وہ انسان کی اعلیٰ اقدار کی قدرداں ہیں۔ اپنے خاکوں میں بڑے واضح انداز میں اپنی پسندیدہ اقدار کا اظہار کرتی جاتی ہیں۔ دوسری چیز جسے قمر جمالی اشخاص میں تلاش کرتی ہیں وہ علم کمال ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں محبت، جفاکشی، راست گفتاری ، بے لوث محبت ، جذبۂ خدمت اور وضع کرداری پر زیادہ زور دیا ہے۔ قمر جمالی نے اپنے خاکوں میں اساتذہ کرام اور معاصرین کی سیرت کو بھی اُجاگر کیا ہے جن سے ان کی قربت رہی ہے۔ الغرض ان کے خاکے جہاں ہمیں مختلف شخصیتوں سے واقف کرواتے ہیں وہیں قمر جمالی کی شخصیت کو سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

قمر جمالی کے ادبی سفر کا کارواں یہیں نہیں رکتا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے وہ صحافت جیسے مشکل میدان میں بھی اپنے کالموں اور مختلف طے شدہ عنوانات پر قلم اٹھاتی رہیں۔ اکتوبر 1996 سے 2000 تک روزنامہ 'ہمارا عوام' کے ادبی صفحہ 'دھنک' کی نگراں رہیں اور چار سال تک مسلسل ایک ادبی کالم 'زمین کھا گئی

آسماں کیسے کیسے' شاید آپ جانتے ہوں گے۔ عنوان سے سماجی حالات پر تبصرے اور 'داستان' پر کمنٹری لکھتی رہیں۔ اس کے علاوہ قمر جمالی سہ ماہی 'تناظر' کی ایڈیٹر بھی رہ چکی ہیں۔ سہ ماہی 'تناظر' کی صدارت کی ذمے داری بلراج ورما نے قمر جمالی کے سپرد کی تھی اور اس ذمے داری کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ سہ ماہی رسالہ پہلے دہلی سے شائع ہوتا تھا پھر بلراج ورما کے کہنے پر قمر جمالی نے چار سال تک اس کی ادارت کی ذمے داری اٹھاتی رہیں۔ اس رسالے کو حیدر آباد سے جاری کرنے کے پہلے ہی سال 'نیا تناظر' سہ ماہی کا ایک ایڈیشن قمر جمالی نے حیدر آباد سے نکالا جس کو 1995 میں کتھا جرنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پھر موصوفہ نے اپنی ذاتی مصروفیات کے سبب اس ذمے داری کو واپس بلراج ورما کو واپس کر دیا۔ غرض قمر جمالی کی صحافتی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

قمر جمالی نے رپورتاژ بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے کل آٹھ رپورتاژ تحریر کیے ہیں۔ ان کے رپورتاژ کسی سمینار یا ادبی کانفرنس کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے رپورتاژ کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مختصر رپورتاژ ہیں اور انھوں نے موضوع کے اعتبار سے معروضی انداز کو اپنایا ہے۔ انھوں نے حقیقی واقعات کے بیان کے ساتھ شخصی تاثرات و کیفیات کو بھی پیش کیا ہے۔ قمر جمالی نے ہندوستان کے تاریخی ، سیاسی، سماجی و معاشرتی ، تہذیبی اور مذہبی واقعات کا بیان بڑے دلکش انداز میں کیا ہے جس سے اس عہد کے معاشرتی حالات، تہذیبی روایات کے علاوہ ادبی رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھیں کردار نگاری پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کے رپورتاژ میں صرف دوسرے اشخاص ہی نظر نہیں آتے بلکہ ان کا مرکزی کردار یعنی قمر جمالی کی شخصیت بھی موقع و محل کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے کیونکہ وہ خود ان چشم دید واقعات کی عینی شاہد ہیں اور ساتھ ہی ان کے خیالات و نظریات کا بھی پوری طرح علم ہوتا ہے۔ ان کے تمام رپورتاژ میں ادبی چاشنی اور اسلوب کی لطافت پائی جاتی ہے۔ کردار نگاری، واقعہ نگاری منظر نگاری کے علاوہ ماحول آفرینی کی خصوصیت بھی ان کے رپورتاژ میں ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں تمام حقائق کے ساتھ پیش کی ہیں۔ شگفتہ بیانی اور طنز و مزاح کے جوہر اُن کے اسلوب کی خوبی ہے۔

تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تبصروں کے علاوہ قمر جمالی نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر عالمانہ دیباچے اور پیش لفظ بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے جب کسی کتاب کا پیش لفظ و دیباچہ لکھا تو سچائی، ایمانداری، خوش اسلوبی اور سچے دل سے لکھا ہے۔ قمر جمالی نے جن حضرات کی کتابوں کے دیباچے لکھے ان کا کسی نہ کسی طور پر اُن سے گہرائی اور قریبی تعلق رہا ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچوں میں ایسے سوالات بھی اٹھائے ہیں جو ادب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قمر جمالی کی دیباچہ نگاری کا انداز بھی منفرد ہے۔ ان کے لکھے گئے چند دیباچوں میں تنقیدی آرا بھی ملتی ہے۔ دیباچہ 'دل کی دھڑکنوں سے جڑی انیس فاروقی کی کہانیاں' اس کی بہترین مثال ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک معتدل اور متوازن نظریہ رکھتی ہیں اور حد درجہ سادہ رواں اور عام فہم زبان میں دیباچے تحریر کئے ہیں۔

قمر جمالی نے ریڈیو فیچرز بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کے دو ریڈیو فیچر بھی منظر عام پر آئے اور نشر بھی ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا ریڈیو فیچر 'ہوئی مدت کہ غالب مرگیا' فروری 2005 میں اور دوسرا 'قطب بھاگمتی' مارچ 2005 کو آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد سے نشر کیا گیا ہے۔ مرتب و ناشر ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے 2018 میں غالب بصد انداز (غالب پر ریڈیائی تحریریں) کے نام سے ایک کتاب آل انڈیا ریڈیو کے زیرِ اہتمام ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع کی ہے جس میں انھوں نے ریڈیو فیچر 'ہوئی مدت کہ غالب' کو بھی شامل کیا ہے۔ ریڈیو فیچر 'ہوئی مدت کہ غالب مرگیا' کے پروگرام میں غالب کے کلام کی روشنی میں ان کی پوری زندگی ان کے عہد کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کو اچھی طرح نشر کیا گیا ہے۔

❑❑❑

Sayed Faryadbee
Research Scholar
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032 (Telangana)
E-mail : sayedfaryad2121@gmail.com

سلیم انصاری

عنبر عابد کی شاعری

موجودہ عہد میں بھوپال مدھیہ پردیش کے ادبی افق پر جن چند شاعرات نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سبب ناقدینِ شعروادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، ان میں عنبر عابد کا نام نمایاں طور پر قابلِ ذکر ہے۔ میں ان کی شعری اور نثری تخلیقات کو رسائل و جرائد میں گزشتہ کئی برسوں سے پڑھ رہا ہوں اور کسی حد تک ان کے بارے میں مثبت خیالات بھی رکھتا ہوں۔ مگر گزشتہ دنوں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام ''ہم شہرِ غزل والے'' مجھے دستیاب ہوا تو عنبر عابد کی شعری اور فکری کائنات کے بارے میں، مجموعی رائے قائم کرنے میں قدرے آسانی ہوئی۔

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال، گہوارۂ علم ادب اور شہرِ غزل کی حیثیت سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس شہر نے علم وادب، کھیل، سیاست، یعنی ہر شعبۂ حیات میں ایسی نابغۂ روزگار شخصیات پیدا کی ہیں جن پر اہلِ بھوپال کو بجا طور پر فخر حاصل ہے۔ زیرِ نظر شعری مجموعے میں شامل عنبر عابد کی تحریر سے مجھے علم ہوا کہ ان کی والدہ بھوپال کی ایک خوش فکر شاعرہ تھیں اور پانچ کتابوں کی مصنفہ بھی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ملک اور بیرونِ ملک بشمول پاکستان، سعودی عرب اور امریکہ کے متعدد مشاعروں میں اپنے وطنِ عزیز کی کامیاب نمائندگی بھی کی تھی۔ یعنی یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھیں بچپن سے ہی گھر میں علمی اور ادبی ماحول میسر آیا، لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش جس طرح کے ادبی اور تہذیبی ماحول میں ہوئی اس میں کسی کا آگے چل کر شاعرہ یا ادیبہ ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں شامل اپنی تحریر عرضِ حال میں خود بھی اعتراف کیا ہے کہ امی کی شاعری کو سنتے اور پڑھتے ہوئے مجھ میں کب شعری تخلیق کا ذوق سرایت کر گیا مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ عام طور پر شاعرات کو پروفیشنل اردو مشاعروں میں آرائش اور زیبائش کی شے کے طور پر ہی دیکھا جاتا ہے، مگر مجھے خوشی اور اطمینان ہے کہ عنبر عابد نے اس کلیشے کو مسمار کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے یہاں ادبی مطالعے اور مجاہدے کا ذوق بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ اپنی شاعری کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ سنجیدہ ہیں بلکہ انھوں نے مترنم کمرشیل اور سہل پسند شاعرات سے علاحدہ اپنے لیے ایک الگ اور مشکل راہ کا انتخاب کیا ہے اور ایوانِ ادب کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ظفر نسیمی کی شعری اور ادبی تربیت کے نتیجے میں انھوں نے بہت کم عرصے میں ہی اپنی تخلیقی شناخت مستحکم کر لی ہے اور اپنے قدر دانوں کی فہرست میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

عنبر عابد کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام ’’ہم شہرِ غزل والے‘‘ کے مطالعے سے گزرتے ہوئے کئی اکابرینِ ادب کی آرا سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا، جن میں بھوپال کے کہنہ مشق اور نئی شعری روایات نیز صحت مند جدیدیت کے علمبردار اور معتبر شاعر ظفر صہبائی نے عنبر عابد کی شاعری پر حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’ان کی شاعری اپنے تازہ اسلوب اور سبز خیالی کے سبب انسانی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔‘ کوثر صدیقی کے مطابق ’عنبر شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ کی شعری وراثتوں کی امین بھی ہیں۔‘ یہ ایک بڑی بات ہے ورنہ اردو زبان و ادب اور اس کے رسم الخط سے بے توجہی کے اس دور میں بے شمار ادبی گھرانوں کی ادبی وراثتوں کا انجام ہمارے سامنے ہے۔

’’عنبر عابد کی شاعری کے مطالعے کے دوران کئی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ دیگر شاعرات کی طرح وہ محض قافیہ پیمائی پر یقین نہیں رکھتیں بلکہ ان کے یہاں سنجیدہ فکر و شعور اور زبان کے رکھ رکھاؤ کا ایک سلیقہ موجود ہے۔وہ الفاظ و تراکیب کی صحت، اسلوب اور فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ خیال کی گہرائی اور مضمون آفرینی کو بھی شاعری کے لیے لازم سمجھتی ہیں۔غالباً یہی سبب ہے کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں عصری شعور و فکر سے پر اشعار جا بہ جا نظر آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی ریاضت کو اچھی شاعری کے لیے ضروری سمجھتی ہیں۔‘‘

عنبر عابد کی شاعری کے مطالعے کے دوران کئی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ دیگر شاعرات کی طرح وہ محض قافیہ پیمائی پر یقین نہیں رکھتیں بلکہ ان کے یہاں سنجیدہ فکر وشعور اور زبان کے رکھ رکھاؤ کا ایک سلیقہ موجود ہے۔وہ الفاظ وتراکیب کی صحت، اسلوب اور فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ خیال کی گہرائی اور مضمون آفرینی کو بھی شاعری کے لیے لازم سمجھتی ہیں۔غالبًا یہی سبب ہے کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں عصری شعور وفکر سے پر اشعار جا بہ جا نظر آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی ریاضت کو اچھی شاعری کے لیے ضروری سمجھتی ہیں۔ان کے اسی خیال کے نتیجے میں اس طرح کے اشعار بھی نذرِ قرطاس ہوئے۔

شعر کہنے کے لیے شعر فقط کیا کہنا
بات تو تب ہے کہ جب بات ہو گہرائی کی

لفظ مل جائیں تو اشعار کی تشکیل کریں
ورنہ کس طرح خیالات کی ترسیل کریں

دے تو دیے ہیں تو نے یہ لوح وقلم مجھے
علم وشعور وفکر کی بھی روشنائی دے

ان اشعار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عنبر عابد تخلیقِ شعر کے داخلی نظام اور فکری آہنگ کا ادراک رکھتی ہیں۔انھیں احساس ہے کہ اچھی اور اثر انگیز شاعری کے لیے شعور وفکر کی گہرائی کے علاوہ زبان، اسلوب اور الفاظ وتراکیب پر بھی دسترس ضروری ہے۔انھیں یہ اندازہ بھی ہے کہ فقط قافیہ پیمائی سے شاعری میں کوئی تاثر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔اسی لیے وہ خدا سے فکر وشعور کی گہرائی کے ساتھ زبان پر دسترس کے لیے بھی دعائیں کرتی ہیں۔

شگفتہ فرحت نے عنبر عابد کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھیں اپنے شہر بھوپال سے بے پناہ عقیدت اور محبت ہے اور اسی مناسبت سے انھوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام ’’ہم شہرِ غزل والے‘‘ رکھا ہے۔اس حوالے سے ان کی کتاب میں کئی اشعار بھی ملتے ہیں، مثال کے طور پر

یہاں اردو ہواؤں میں، گھلا جادو فضاؤں میں
ادب کے چشمے بہتے ہیں، اسے بھوپال کہتے ہیں

وراثت یہ ہماری ہے، ہمیں جاں سے بھی پیاری ہے
یہیں پر ہم بھی رہتے ہیں، اسے بھوپال کہتے ہیں

اپنی شاعری میں اپنی مٹی سے محبت کا اظہار اردو میں کوئی نئی بات نہیں، ان سے قبل بھی بہت سارے شعرانے اپنی مٹی سے محبت کا اظہار کیا ہے مگر عنبر عابد کے یہاں شہرِ غزل بھوپال سے عشق میں ایک طرح کی فطری بے ساختگی اور والہانہ پن ہے جو قاری کے ذہن و دل پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہی نہیں ان کی شاعری کے بارے میں مہتاب عالم کی اس ایماندارانہ اور بے باک رائے سے مجھے کلی اتفاق ہے کہ عنبر عابد کی شاعری میں عظمتِ رفتہ کا بیان بھی ہے اور عہدِ حاضر کا نوحہ بھی۔ موجودہ عہد میں ہمارے ناقدینِ ادب کا حال یہ ہے کہ وہ شاعرات کی شاعری کا مطالعہ کیے بغیر ان پر نسائی لب و لہجے کا ٹھپہ لگا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ رویہ درست نہیں ہے کیونکہ جن شاعرات کا رشتہ قرطاس وقلم سے حقیقی ہوتا ہے اپنی قوتِ مشاہدہ اور زندگی کے تجربات کے تنوع کے سبب وہ اپنی شاعری کو متعدد دشاؤں میں منعکس کرنے کے ہنر سے واقف ہوتی ہیں۔ مجھے خوشی اور اطمینان ہے کہ ڈاکٹر عنبر عابد نے اپنے کئی اشعار میں گہرے عصری فکر و شعور کا منفرد منظر نامہ پیش کیا ہے اور اس تخلیقی ہنرمندی میں انھوں نے خود کو کسی بھی قسم کی نظریاتی یا سیاسی وابستگی کا پابند نہیں رکھا اور نہ ہی اپنا تخلیقی رجحان کسی ادبی تحریک سے وابستہ کیا۔ ان کے یہاں شعری لہجے میں ایک طرح کی شائستگی اور دھیما پن محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ارد گرد رونما ہونے والے حادثات و واقعات، نیز سائبر عہد کی دوڑتی بھاگتی زندگی کے درمیان فرد اور معاشرے کے مابین ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کی بے یقینی، تہذیبی قدروں کے زوال اور عصری مسائل و مصائب سے نبرد آزما انسان کی بے بسی اور شکست و ریخت کو اپنی شاعری کا معتبر حوالہ بنا دینے والی بھوپال کی اس شاعرہ کے یہاں زندگی کے کئی اور شیڈس بھی نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

پہلے زخموں کا چکھاتے ہیں مزہ مرہم کا
پھر مرے دوست سلیقے سے نمک رکھتے ہیں

خونِ دل سے لکھ رہی ہوں داستانِ زندگی
دیکھیے ہوتا ہے کیا انجام اس تحریر کا

عزم و ہمت کو بنا کر سدا سوئی دھاگہ
زندگی ہم نے ترے زخم کی ترپائی کی

شب کی تاریکی و وحشت کا تقاضہ یہ ہے
ساز و آواز سے روشن کوئی قندیل کریں

جب انا ہے رگ و ریشے میں سرایت عنبر
کس طرح اس کے ہر اک حکم کی تعمیل کریں

دوا تو آپ فقط اپنے زخم کی ڈھونڈیں
ہمارے زخم تو بھر جائیں گے دعا سے بھی

" اگرچہ ان کی شاعری کا ڈکشن سہل، ترسیل کے المیے اور معنوی پیچیدگیوں سے پاک ہے مگر جو کلیدی الفاظ استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ان میں زندگی، آئینہ، زخم، زمانہ اور دنیا وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں غیر شعوری طور پر یہ التزام بھی رکھا ہے کہ وہ عصری فکر و شعور اور انسانی مسائل و مصائب سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ نظر آئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں رومانی تخیلات اور حسن و عشق کے جذبات وغیرہ کا بھی اظہار ہے مگر صنفِ نازک کی رعایت سے ہمدردی یا کمزوری کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔"

بے سبب آنکھ سے پھسلا تھا جو موتی بن کر
مل گیا خاک میں تو ہم نے اٹھایا بھی نہیں

کسی کے زخم پہ مرہم کسی کو زخمِ دروں
زمانے کا تو ہمیشہ سے بس یہی ڈھب ہے

ان اشعار کے مطالعے سے قارئین کو عنبر عابد کے یہاں موجود شعری منظر نامے کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر چہ ان کی شاعری کا ڈکشن سہل، ترسیل کے المیے اور معنوی پیچیدگیوں سے پاک ہے مگر جو کلیدی الفاظ استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ان میں زندگی، آئینہ، زخم، زمانہ اور دنیا وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں غیر شعوری طور پر یہ التزام بھی رکھا ہے کہ وہ عصری فکر و شعور اور انسانی مسائل و مصائب سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ نظر آئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں رومانی تخیلات اور حسن و عشق کے جذبات وغیرہ کا بھی اظہار ہے مگر صنفِ نازک کی رعایت سے ہمدردی یا کمزوری کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں سب سے زیادہ مضبوط استعارہ زخم ہے۔ ان کے یہاں معاشرے کی جس عام سی عورت کا تصور ہے وہ آنسو نہیں بہاتی بلکہ جذباتی لحاظ سے مضبوط بھی ہے اور زندگی کے ناسازگار حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ یہی نہیں وہ اپنے زخموں سے روشنی کشید کر کے زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ وہ انا پرست نہیں بلکہ خوددار ہے اور خوداعتمادی کی دولت سے مالا مال ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ عنبر عابد کی شاعری کو کسی ازم یا ادبی تحریک یا جدید و قدیم کے خانے میں رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ انھوں نے اپنی تخلیقی فکر کو کسی بھی سیاسی یا نظریاتی منشور کا مرہونِ منت نہیں بنایا بلکہ انھوں نے اپنا شعری سفر اپنے شعور و آگہی کی روشنی میں جاری رکھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری سے گزرتے ہوتے مجھے جو ایک بات کسی حد تک نا مناسب لگی وہ یہ کہ انھوں نے اپنی غزلوں کے اشعار کے انتخاب میں سخت رویہ نہیں اپنایا جس کے نتیجے میں بعض غزلوں میں کچھ کمزور اشعار بھی شامل ہو گئے ہیں حالانکہ چودہ، پندرہ اشعار پر مشتمل غزلوں سے کچھ اشعار قلم زد کر دینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا مگر غزلیں ضرور COMPACT ہو جاتیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ شعری مجموعے کی ترتیب و انتخاب میں میرے اس مشورے پر غور کیا جائے گا۔

عنبر عابد شاعری کے علاوہ نثر سے بھی شغف رکھتی ہیں۔ ان کے ادبی مضامین رسائل و جرائد کے واسطے سے قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔ وہ اردو زبان و ادب اور اس کے رسم الخط سے محبت کرنے والی شاعرہ ہیں، جس کا ثبوت ان کے زیرِ نظر مجموعے ہم شہرِ غزل والے میں شامل کئی اشعار سے فراہم کیا جا سکتا ہے۔

خواب اردو کا ہی اوڑھے ہے خموشی میری
اور صدا بھی ہے مری صرف صدائے اردو

اپنے بچوں کو مگر کون سکھاتا ہے یہاں
یوں تو کہنے کو ہے ہر شخص فدائے اردو

اس طرح کے اور بھی کئی اشعار ان کے مجموعے میں مل جاتے ہیں جس سے اردو زبان و ادب کے تئیں ان کی دردمندی کا احساس ہوتا ہے۔ انھیں اندازہ ہے کہ کوئی بھی زبان اپنے رسم الخط کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی انھیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اردو دشمنی کے اس دور میں، اردو سے اپنی محبت کا دم بھرنے والے لوگ بھی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ زبان ختم ہو جائے گی۔ مجھے ان کا زیرِ نظر مجموعۂ کلام پڑھ کر ایک خوش گوار احساس ہوا۔ ان کا شعری سفر اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ہنوز جاری ہے لہٰذا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ ''ہم شہرِ غزل والے'' سے آگے کا تخلیقی منظر نامہ پیش کریں گی۔

□□□

Saleem Ansari
HIG-3 Anand Sagar
Adhartal Jabalpur (M.P) 482004
Mob- 7070135643

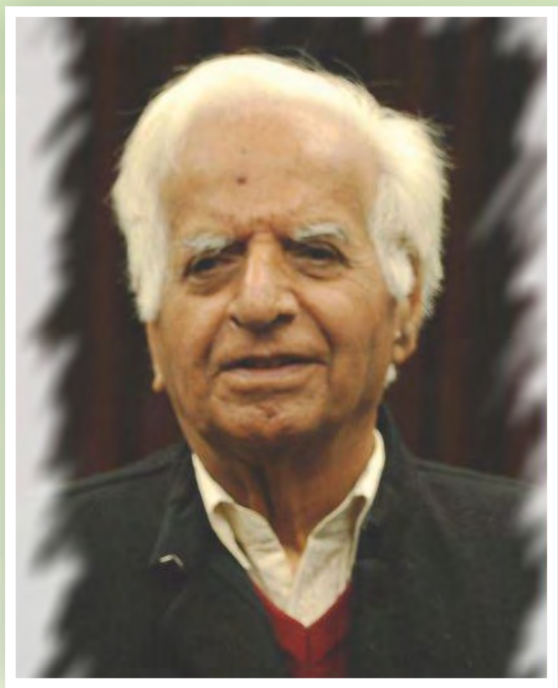

زمیلہ بیگم

جوگندر پال کے افسانوں میں نسوانی کردار

جوگندر پال کا شمار ان ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے مختلف موضوعات و مسائل کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے افسانوں کے موضوعات ومسائل ہندوستان اورافریقہ کے ماحول سے ماخوذ ہیں کیوں کہ وہ چودہ برس تک افریقہ میں مقیم رہے۔ افریقہ میں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کی زندگی اور معاشرتی ماحول کو بنیاد بنا کرکئی افسانے تخلیق کیے۔

جوگندر پال کی افسانہ نگاری کا آغاز ہندوستان کی آزادی سے قبل ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ''تیاگ سے پہلے'' ہے جو پہلی مرتبہ مولانا شاہد احمد دہلوی کے رسالے 'ساقی' میں شائع ہوا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندستانی تہذیب وثقافت کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اورانھوں نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ افسانہ نگار افسانہ لکھتے وقت اپنے افسانے میں شامل ہوکر قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں میں عورت کا کردار نمایاں رہا ہے۔ ان کے افسانے ہندوستان کے علاوہ افریقہ کے سماجی مسائل کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے افریقہ میں قیام کے دوران بے شمار افسانے لکھے اوران سبھی افسانوں میں انسانی زندگی کے ان گنت موضوعات کو پیش کیا۔ جوگندر پال سے پہلے بھی افسانوں میں پریم چند، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر اور کرشن چندر وغیرہ نے بھی عورتوں سے متعلق موضوعات ومسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیے۔

جوگندر پال نے ہندوستان اور افریقہ دونوں ملکوں میں قیام کے دوران جو بھی افسانے لکھے ان افسانوں میں بھی عورتوں سے متعلق مسائل کو پیش کیا مثلاً سماج میں عورت کی حیثیت، تعلیم، شوہر اور ساس، نندوں کے مظالم، بیوہ عورت کی شادی، عورت کی ناقدری، اولاد نہ ہونے پر عورت کو قصوروار ٹھہرانا، عورت کی نفسیاتی زندگی، بیوہ عورتوں کے مسائل، شوہروں کا دوسری عورتوں میں دلچسپی لینا، بوڑھی عورتوں کے متعلق مسائل وغیرہ کو بہت ہی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

جوگندر پال کا افسانہ ''سب سے خوب صورت'' عورت کی نفسیاتی کیفیت پر مبنی ہے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جدید معاشرے میں مہذب عورتوں کا کیسے مذاق اڑایا جاتا ہے۔سماج میں عورت کی بڑی عزت اور اہم جگہ ہے لیکن عورت اپنے حسن سے اس قدر باخبر ہے کہ اسے اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنے برے بھلے کا علم تک نہیں ہے۔ گویا اس افسانے میں جوگندر پال نے عورتوں کو اپنے حسن کی نمائش نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

افسانہ ''بایاں سایہ'' میں بھی ایک ایسی عورت کو موضوع بنایا گیا ہے جس کا شوہر ایک بچے کو چھوڑ کر مر جاتا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار لاجو ہے، جو ساری عمر اپنے شوہر کی نشانی کو اپنے ساتھ رکھتی ہے اور دوسری شادی نہیں کرتی۔ وہ اپنی پوری جوانی اپنے بچے کی پرورش میں صرف کر دیتی ہے۔ جوگندر پال نے اس افسانے میں ایک ایسی عورت کا کردار پیش کیا ہے جو اپنی خواہشات کو اپنی اولاد کے لیے قربان کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے شوہر کو تو ظاہری موت آتی ہے لیکن اس کی بیوی لاجو زندہ ہو کر بھی مردہ ہے۔لاجو کا سسر لاجو کو مطمئن کرنے کے لیے گیتا دیتا ہے اور کہتا ہے:

''قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔لاجو بیٹی دھیرج رکھ
یہ لو گیتا اسے پڑھ کر تمہارے جی کو شانتی ملے گی۔''

(افسانہ ''بایاں سایہ'' میں کیوں سوچوں، جوگندر پال، ادبستان اردو، امرتسر، ص 104)

جوگندر پال نے اپنے افسانوں میں عورتوں سے متعلق تمام موضوعات کو پیش کیا ہے۔ وہ عورت کے ہر رنگ و روپ کو مختلف انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔

افسانہ ''مہابھارت'' میں ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جس کا نام دروپدی ہے۔ دروپدی زمانے کے ظلم و ستم سہتے سہتے اس قدر پریشان ہو جاتی ہے کہ وہ معاشرتی مظالم کے خلاف اپنی جدوجہد میں بھگوان سے مدد مانگتی ہے کہ پچھلے زمانے کی دروپدی کی طرح آپ میری بھی لاج رکھ لینا۔

ان کے افسانے خاص طور پر 'بایاں سایہ' اور 'مہابھارت' میں عورت کے جذبے، قربانی، سماجی جبر کو نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور خوشیوں کو کس طرح دوسروں کے لیے قربان کر دیتی ہے۔ جوگندر پال نے ان افسانوں کے ذریعے عورت کے مقام، جدوجہد اور اس کے جذبات کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

> ''جوگندرپال نے عورت کی بے بسی اورمجبوری کو بہت ہی حسن خوبی سے پیش کیا ہے۔ تقسیم کی وجہ سے اسے اپنے شوہر کا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ جوگندرپال نے افسانہ 'دریاؤں پیاس' میں فلیش بیک کی تکنیک کو استعمال کرکے 'بے بے' کردار کے ذریعے ہر عورت کے کرب، دکھ اورممتاکی بے پناہ محبت سے افسانے کو بڑا پُراثر بنادیا ہے۔ جوگندرپال کی انفرادیت ان کی کردارنگاری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے کردار انسانی جذبات اورنفسیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے عورت کے مختلف رنگ، روپ، ذہنی کیفیات کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔اپنے کرداروں کی روح کومحسوس کیا ہے اور ان کے ساتھ افسانے میں شامل ہوکر زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا ہے۔ ان کا افسانہ 'جادو' اس کی عمدہ مثال ہے۔''

افسانہ ''دریاؤں پیاس'' میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو تقسیم ہند کے وقت اپنے شوہر کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کہانی میں عورت کے دکھ اور قربانی کو فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے پیش کیا ہے۔ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے کہ کبھی وہ اور اس کا شوہر ایک عالی شان حویلی میں بڑے سکون سے رہا کرتے تھے۔ ماضی میں وہ اپنے گھر کی ملکہ تھی، آج اپنے بیٹے کے رحم و کرم پر جی رہی ہے۔اس کے شوہر نے اپنی موت سے

پہلے کہا تھا کہ تم یہ حویلی چھوڑ کر مت جانا لیکن تقسیم ہند کے وقت خود اس کے شوہر کی روح نے حویلی چھوڑنے کو کہا۔

”نہیں منے کی بے بے نہیں کسی نے قتل کر دیا تو مجھے جہنم
میں بھی اس کا پیچھا کرنا ہوگا اور میں وہاں لوٹ نہ سکوں گا۔
نہیں نہیں منے کی بے بے اس وقت یہاں سے چلی جاؤ“

(افسانہ’دریاؤں پیاس‘، بےمحاورہ، جوگندار پال، کیلاش پبلشرز اورنگ آباد ص 4)

جوگندر پال نے عورت کی بے بسی اور مجبوری کو بہت ہی حسن خوبی سے پیش کیا ہے۔تقسیم کی وجہ سے اسے اپنے شوہر کا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ جوگندر پال نے افسانہ’دریاؤں پیاس‘ میں فلیش بیک کی تکنیک کو استعمال کر کے’بے بے‘ کردار کے ذریعے ہر عورت کے کرب، دکھ اور ممتا کی بے پناہ محبت سے افسانے کو بڑا پُراثر بنادیا ہے۔ جوگندر پال کی انفرادیت ان کی کردارنگاری میں دیکھنے کوملتی ہے۔ان کے کردار انسانی جذبات اور نفسیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے عورت کے مختلف رنگ، روپ، ذہنی کیفیات کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔اپنے کرداروں کی روح کومحسوس کیا ہے اور ان کے ساتھ افسانے میں شامل ہوکر زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا ہے۔ان کا افسانہ’جادو‘اس کی عمدہ مثال ہے۔

افسانہ”جادو“ میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جسم فروشی کو اپنا مقدر بنالیتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار بھابو ہے۔ جب وہ ماں بنتی ہے تو وہ اپنے بیٹے سے بے انتہا محبت کرتی ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا بیٹا جوان ہوکر اسے اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ سماج میں لوگ بھابو کا جینا محال کر دیتے ہیں، طرح طرح کے الزامات لگا کر اسے مزید اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ان حالات کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے اور مکمل طور پر بے بس ہوجاتی ہے۔اس کی حالت اتنی نازک ہوجاتی ہے کہ اسے دیکھ کر پتھر دل بھی پگھل جائے مگر انسان کا نہیں۔اقتباس ملاحظہ کیجیے:

”پتھر کا پتھر دیوار سے جڑا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر دیکھے
جا رہا تھا کہ اپنی جان چھڑک کر بھابو نے ایک بے جان
شے میں جان ڈال دی ہے......مجھ میں بھی!“

(افسانہ جادو، بےارادہ، جوگندر پال، زمزم بک ٹرسٹ دہلی ص 14)

جوگندر پال کا افسانہ”جادو“ کا کردار بھابو ایک ایسا کردار ہے جو زمانے کے ظلم و ستم سہہ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔سماج ہمیشہ مظلوم عورتوں کے اکیلے پن کا فائدہ ہی اٹھاتا ہے۔ جوگندر پال نے اپنے افسانوں میں عورتوں سے متعلق وہ باتیں بتائی ہیں جو اور کوئی بتانے سے قاصر ہے۔جوگندر پال کے افسانے خاص طور پر”دریاؤں پیاس“ اور”جادو“ عورت کے مسائل، قربانیوں اور سماجی رویوں کے دوہرے معیار کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں قاری کو معاشرتی جبر پر غور کرنے اور اس میں بدلاؤ لانے کی طرف مائل کرتی ہیں۔یہ افسانے جوگندر پال کی کردارنگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

افسانہ”سہن سکھوں“ میں ایک ایسی عورت کے کردار کو پیش کیا گیا ہے جو بدچلن اور بدکردار ہے۔

افسانہ ”دادیاں“ میں ایک ضعیف عورت کی زندگی کے آخری ایام کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنے گھر میں تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ اس کا پوتا رام چند اسے اکیلا چھوڑ کر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سرکاری کوارٹر میں منتقل ہوگیا ہے اور دادی اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے تنہائی کی زندگی گزار رہی ہے ۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

”دادی تو اکیلی، مگر اس قدر اپنے ساتھ تھی کہ ایک کوٹھری سے دوسری میں چلی جاتی تو پہلے سے ہی وہاں آپ کو اپنے انتظار میں پاتی۔“

افسانہ”ہری کیرتن“ میں بھی جوگندر پال نے مرکزی کردار ایک عورت کو ہی بنایا ہے۔افسانے کا موضوع انسان کی بدعنوانیاں ہیں کہ کس طرح انسان اپنی بیوی کے کردار پر شک کرتا ہے۔ اس

وجہ سے پورے گھر کا سکون برباد ہوجاتا ہے۔ افسانے کا کردار بڑی بہو اپنے شوہر کے ہاتھوں ساری زندگی محرومیوں کا شکار رہتی ہے۔ کیونکہ اس کا شوہر اپنے باپ بڑے بابو پر شک کرتا ہے کہ اس کی ماں کے وصال کے بعد اس کا باپ اپنی بہو پر گندی نظر ڈالتا ہے۔ اسی دن سے وہ اپنی بیوی کو اس کا حق ادا نہیں کرتا ہے۔ بیچاری بڑی بہو اپنے شوہر کے شک کی وجہ سے محرومیوں کا شکار ہوجاتی ہے۔ سماج ہمیشہ عورت کو ہی دباتا آیا ہے۔ یہ افسانہ ایک عورت کی پاکیزگی اور قربانی کو ظاہر کرتا ہے۔ جوگندر پال نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عورت کے مختلف کرداروں کی ذہنی کیفیت کے متعدد پہلوؤں کو نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

افسانہ ''دادیاں'' میں ایک ضعیف عورت کی زندگی کے آخری ایام کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنے گھر میں تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ اس کا پوتا رام چندا سے اکیلا چھوڑ کر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سرکاری کوارٹر میں منتقل ہوگیا ہے اور دادی اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے تنہائی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دادی تو اکیلی، مگر اس قدر اپنے ساتھ تھی کہ ایک
> کوٹھری سے دوسری میں چلی جاتی تو پہلے سے ہی وہاں
> آپ کو اپنے انتظار میں پاتی۔''

جوگندر پال نے افسانہ 'دادیاں' میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ بوڑھی عورتیں اپنے پرانے گھروں سے گہری محبت کرتی ہیں اور اکثر اپنی آخری سانس تک وہیں رہنا چاہتی ہیں۔ یہ افسانہ جوگندر پال کی بہترین کردارنگاری کی مثال ہے۔

افسانہ 'اپنا اپنا' بھی عورت کے ساتھ کیے جانے والے ظالمانہ رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ سماج ہمیشہ سے عورت کو دبانے کی روش اختیار کرتا آیا ہے اور بعض اوقات شک وشبہات کی بنیاد پر خواتین کو ان کے حقوق سے محروم کردیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال افسانے میں ایک بیوی کی محرومی ہے جسے اس کے شوہر کے شک نے سخت تکلیف میں مبتلا کردیا ہے۔ افسانے میں یہ دکھایا گیا

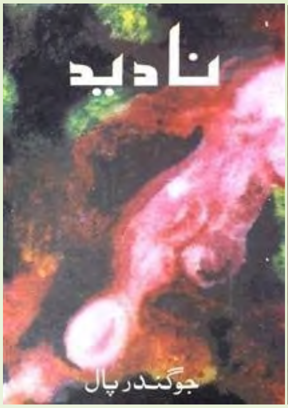

ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی گناہ میں ملوث ہوتے ہیں لیکن سزا صرف عورت کو دی جاتی ہے۔ اسے بدچلن، بدکردار اور بدذات جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے جب کہ مرد پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جاتا۔ افسانہ 'اپنا اپنا' پڑھنے کے بعد قارئین کے اندر سماج میں عورت پر لگنے والے بے بنیاد الزامات کے خلاف آواز بلند کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

افسانہ 'کچی کنواری' میں تین لڑکیوں کے کردار کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض لڑکیاں اپنے غیر اخلاقی رویے کی وجہ سے معاشرتی زوال میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کہانی میں دو لڑکیاں شادی شدہ اور ایک کنواری ہے۔ جوگندر پال نے اس افسانے میں یہ بتایا ہے کہ بعض خواتین کی اخلاقی پستی سماج کی بگڑتی ہوئی صورت حال میں کیسے اضافہ کررہی ہے۔

افسانہ 'نوزائیدہ' میں موجودہ دور کی عورتوں کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح لوگ عورت کی عزت کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اس کہانی میں کچھ افراد شراب نوشی کے بعد ایک عورت کو تماشے کے طور پر دیکھتے ہیں، جو سماج میں عورت کے استحصال کی ایک بھیانک تصویر ہے۔

❑❑❑

Zamila Begam
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)
zamilabegam119@gmail.com

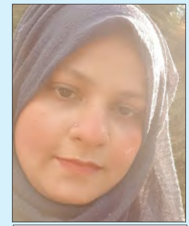

تبسم آرا

اختر اورینوی

بحیثیت افسانہ نگار

اختر اورینوی اردو ادب کے قاری کے لیے کوئی نیا نام نہیں ہے۔اردو دنیا انھیں ایک معتبر افسانہ نگار، ناقد اور محقق کی حیثیت سے جانتی ہے۔انھوں نے فکر، ہئیت اور تکنیک کے نئے نئے تجربے کیے ہیں۔اظہار و اسلوب کے بھی نئے نمونے پیش کیے ہیں۔ان کے پاس زبان و بیان کا بیش بہا خزانہ ہے۔وہ جا بجا محاوروں اور استعاروں کا استعمال کر کے اپنی بات کو پر معنی اور پر کشش بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کی پیدائش 19 اگست 1910 کو مشہور قصبہ کاکو، ضلع گیا میں ہوئی۔

اختر اورینوی کو بچپن سے قصے کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ان کے شوق اور قصے کہانیوں سے دلچسپی نے انھیں بعد میں افسانہ نگاری پر آمادہ کیا۔یعنی ان کے بچپن کا ذہنی رجحان، ان کے مستقبل کی راہ ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔بقول اختر اورینوی:

”بچپن میں کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا،گھر کی بڑی بوڑھیوں کی خوشامدیں کیا کرتا اور خوب کہانیاں سنا کرتا تھا۔“

بحوالہ اختر شناسی (ساغر نو پٹنہ، اختر اورینوی نمبر سے ماخوذ) ارشد مسعود ہاشمی، ص۔99

ایک فنکار کی فنکاری پر چاہے وہ فکری ہو یا فنی، اس کے عہد کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجیے ہر عہد اپنے فنکار کی تشکیل خود کرتا ہے۔ہر عہد کی کچھ مختلف خصوصیات ہوتی ہیں جن کے واضح اثرات فن پارے پر دکھائی دیتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ فنکار کی داخلی کیفیات، فن پارے کی تشکیل میں اپنا اہم رول ادا کرتی ہیں لیکن تب بھی اس پر اس کے عہد کے اثرات کو سرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔اختر اورینوی نے جب لکھنا شروع کیا اس کے کچھ ہی عرصے بعد ترقی پسند مصنفین کا دور شروع ہوا جس سے تقریباً تمام لکھنے والے متاثر ہوئے۔کچھ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اس کے ممبر بن گئے تو کچھ لوگ خیالی طور پر اپنے آپ کو اس تحریک سے وابستہ محسوس کرنے لگے۔وہ دور ہی ایسا تھا جب تمام افراد کے نقطۂ نظر اور ترقی پسند تحریک کے نقطۂ نظر میں مشترک اقدار کا پایا جانا لازمی تھا۔یہ وہ دور تھا جب لوگ رومان کی فضا سے نکل کر حقیقت پسندی کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔اس طرح اگر کوئی حقیقت پسندی کی طرف مائل ہیں تو اس میں ترقی پسندی کے اثرات ہیں، اگر کوئی مقصدیت کو پسند کرتا ہیں تو وہ ترقی پسندوں کی صف میں کھڑا ہے، جمہوری اور اخلاقی اشتراکیت کو ضروری سمجھنا ترقی پسند ہونے کی نشانی ہے۔یہ وہ چند ایسی لازمی شرطیں تھیں جو اس وقت کی ضرورت اور مانگ بن چکی تھیں۔اختر اورینوی نے بھی بہت سے افسانے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھے ہیں جن میں ’شادی کے تحفے‘، ’وہ واقعہ‘، ’کوئلے والا‘ وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ان میں ’وہ واقعہ‘ خاص طور پر ایک ایسا

افسانہ ہے جسے ان کے ترقی پسند ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے زیادہ تر افسانے یا تو حقیقت یا اخلاقی اور جمہوری اشتراکیت کی غمازی کرتے ہیں۔لیکن وہ اس طرح ترقی پسند تحریک کے حمایتی نہیں تھے جس طرح بعض دوسرے ترقی پسند افسانہ نگار تھے، جنھوں نے مقصدیت پر فن کو قربان کر دیا۔اور ینوی صاحب کی ترقی پسند تخلیقات کا سلسلہ 1946 تک چلا۔1946 میں انھوں نے ایک افسانہ 'انھیں مردے نہ کہو' کے عنوان سے لکھا جو ادب لطیف، لاہور میں شائع ہوا۔اس افسانے کے منظرِ عام ہونے کے بعد ترقی پسند مصنفین نے ان کی مخالفت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ انھیں ترقی پسند مصنفین کی صف سے الگ کر دیا گیا۔

موضوعات کے انتخاب میں ایک افسانہ نگار، خارجی حالات و جواز کے ساتھ ساتھ اپنی داخلی کیفیات، ذہنی رجحان، اور فکری وسعت سے بھی بہت حد تک متاثر ہوتا ہے۔ان وجوہات کی بنا پر مختلف افسانہ نگار مختلف النوع موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔کچھ افسانہ نگار رومانی قسم کے افسانے کی تخلیق کرتے ہیں تو کچھ جنسیات اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات و تجربات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ان میں سے کچھ نسوانیت اور اس کی گہرائیوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش میں مشغول نظر آتے ہیں، تو چند ایسے بھی ہیں جو دیہی زندگی کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں اور کچھ شہری زندگی کو پیش کرتے ہیں۔اپنے دور کے عام رجحان سے مطابقت رکھتے ہوئے اختر اورینوی نے زیادہ تر افسانے دیہی پس منظر میں لکھے ہیں۔ساتھ ہی شہری و قصباتی حالاتِ زندگی کو بھی اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔افسانہ "مکان کی تلاش" چھوٹے شہر کے افسانے کی بہترین مثال ہے۔

موضوعات کے انتخاب میں ایک افسانہ نگار، خارجی حالات و جواز کے ساتھ ساتھ اپنی داخلی کیفیات، ذہنی رجحان، اور فکری وسعت سے بھی بہت حد تک متاثر ہوتا ہے۔ان وجوہات کی بنا پر مختلف افسانہ نگار مختلف النوع موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔کچھ افسانہ نگار رومانی قسم کے افسانے کی تخلیق کرتے ہیں تو کچھ اس کے برعکس اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات و تجربات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ان میں سے کچھ نسوانیت اور اس کی گہرائیوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش میں مشغول نظر آتے ہیں، تو چند ایسے بھی ہیں جو دیہی زندگی کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں اور کچھ شہری زندگی کو پیش کرتے ہیں۔اپنے دور کے عام رجحان سے مطابقت رکھتے ہوئے اختر اورینوی نے زیادہ تر افسانے دیہی پس منظر میں لکھے ہیں۔ساتھ ہی شہری وقصباتی حالاتِ زندگی کو بھی اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔افسانہ "مکان کی تلاش" چھوٹے شہر کے افسانے کی بہترین مثال ہے۔علاقہ چاہے جو ہو، انھوں نے اپنے افسانوں میں مزدور طبقے اور کسانوں کو ہی اہمیت دی ہے اور ان کی زندگی پر پڑے ہوئے پردے ہٹانے کی سعی کی ہے۔

اختر اورینوی نے ہر طرح کے افسانے لکھے ہیں مثلاً رومانی، اصلاحی، عصری مزاحیہ، نفسیاتی، روایتی، فلسفیانہ، جنسی، سیاسی، مارکسی، علاقائی، اشتراکی یہاں تک کہ علامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔انھوں نے جو بھی لکھا ہے وہ ان کے سچے جذبات اور گہرے مشاہدات کا عکس معلوم پڑتے ہیں۔ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کی کڑوی سچائیوں کو بھی خوشنما پیرایے بیان دے کر آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔افسانہ 'مریض' اس کی بہترین مثال ہے۔اس کے علاوہ ان کے دیہی قسم کے افسانوں میں بیل گاڑی، کام، ممتا، دو مائیں، سیکھ جھور، رات بھر، شکور دادا وغیرہ شامل ہیں۔شہری افسانوں میں ٹائپسٹ، کوارٹر کی اوٹ سے، انار کلی اور بھول بھلیاں، پندرہ منٹ، سیمنٹ وڈائنامیٹ وغیرہ کو خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کے تخلیقی زمانوں کو تین رجحانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

پہلے ان پر رومان کا غلبہ رہا۔اس کے بعد وہ حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے اور آخر میں فکر و فلسفے کی طرف آ گئے۔لیکن فلسفیانہ رنگ ان کے ہر دور کے افسانوں میں ملتا ہے۔مثال کے طور پر افسانہ

’مریض‘ کا ایک اقتباس دیکھیے جوان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ’منظر وپس منظر‘میں شامل ہے:

’’خدا ایک حقیقت مطلق ہے۔اور’’مطلقیت کے لحاظ سے عیب وثواب کا تصور لا یعنی ہے۔’بھلائی‘ اور’برائی‘محض اضافی لفظ ہیں۔مگرانسانیت کے لیے خدا اور کائنات کی اضافی حیثیت ہی حقیقت کبریٰ ہے کیونکہ ہم عرش کی سطح سے نہیں دیکھ سکتے اور خدا کی طرح ’’محسوس‘‘ کرنے سے قاصر ہیں۔‘‘

(افسانہ مریض،منظر وپس منظر،ص۔197)

’’اختر اورینوی نے ایسے کرداروں کی تخلیق کی ہے جو کسی آسمانی دنیا کے نہیں بلکہ سچی زندگی کے پس منظر میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے جن میں کلرک، مزدور اور سماج کے ستائے ہوئے غریب انسان شامل ہیں۔اختر اورینوی کی درد مندی و ہمدردی ان کرداروں کے ساتھ ہمیشہ رہی ہے۔ان کے کردار زندہ اور جاوید ہیں۔ایسے کردار جو اپنی ذاتی مجبوریوں کے باوجود دوسروں کے سکھ دکھ میں کام آتے ہیں۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر کردار گائوں کے پس منظر سے لیے ہیں اور وہاں کی فضا میں انسانی ہمدردی کا پایا جانا کوئی حیران کن واقعہ نہیں ہے۔اس کی بہترین مثال افسانہ’رات بھر‘کے دونوں دوست رامو اور روپل ہیں۔اختر اورینوی اپنے کرداروں کی روح میں اترنے کا فن جانتے ہیں۔‘‘

اس کے علاوہ افسانہ’ کلیاں اور کانٹے‘ فلسفیانہ رنگ سے بھرا ہوا ہے۔فلسفہ بھی ایسا کہ حیات کی گانٹھوں کوکھول کے رکھ دیتے ہیں۔افسانہ’جونئر‘ میں انھوں نے کتنی خوبی اور کتنے کم الفاظ میں انسان کے حِس کا وہ پل بیان کر دیا ہے جب اس کے لیے سارے دروازے بند ہوتے ہیں اور وہ درد کی حدوں کو پار کر کے بے حِسی میں اپنے نجات کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔کتنی خوبی سے انھوں نے اس بے حِسی کو نجات کا سبب بتایا ہے۔یہ وہ احساس و جذبات ہے جنھیں لفظوں میں بیان کرپانا آسان نہیں:

’’وہ ابھی ناکامی کی اس منزل پر نہیں پہنچا تھا جہاں بے حِسی میں نجات ملتی ہے۔‘‘

(افسانہ جونئر،منظر وپس منظر،ص۔135)

اختر اورینوی نے ایسے کرداروں کی تخلیق کی ہے جو کسی آسمانی دنیا کے نہیں بلکہ سچی زندگی کے پس منظر میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے جن میں کلرک، مزدور اور سماج کے ستائے ہوئے غریب انسان شامل ہیں۔اختر اورینوی کی درد مندی و ہمدردی ان کرداروں کے ساتھ ہمیشہ رہی ہے۔ان کے کردار زندہ اور جاوید ہیں۔ایسے کردار جو اپنی ذاتی مجبوریوں کے باوجود دوسروں کے سکھ دکھ میں کام آتے ہیں۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر کردار گاؤں کے پس منظر سے لیے ہیں اور وہاں کی فضا میں انسانی ہمدردی کا پایا جانا کوئی حیران کن واقعہ نہیں ہے۔اس کی بہترین مثال افسانہ’رات بھر‘کے دونوں دوست رامو اور روپل ہیں۔اختر اورینوی اپنے کرداروں کی روح میں اترنے کا فن جانتے ہیں۔ان کے کردار کہانی کی عام فضا سے مناسبت رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔غریب،امیر، پڑھے لکھے، جاہل، اچھے، برے، ایسے کردار جو دوستی نبھاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر لاٹھی بھی اٹھا لیتے ہیں، اپنے حق کے لیے آواز بھی اٹھاتے ہیں، وہ شکوہ بھی کرتے ہیں اور شکایت بھی۔

انھوں نے سیدھے سادے پلاٹ کو اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ان کے افسانوں میں سادگی ہے لیکن سپاٹ پن نہیں کیوں کہ ان کے افسانوں میں پُرکاری کا رنگ اور رمزیت وایمائیت کی چاشنی جو مختصر افسانے کے پلاٹ کے لیے ضروری ہے، موجود ہے۔ان کے ایک ایک لفظ سے تخیل متحرک ہوتا ہے اور قاری خود اس میں چھپی تفصیل ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے۔

اختر اورینوی اپنی باتوں کو مثال کے ذریعے ثابت کرنا خوب جانتے ہیں۔کسی واقعے کی مناسبت کسی دوسرے واقعے یا بات سے

کرنا ان کا خاص آرٹ ہے۔ان کے افسانوں میں ایسی مثالیں جابجا ملتی ہیں جن میں انھوں نے بڑی خوبصورتی سے روزمرہ میں استعمال ہونے والے باتوں یا واقعے کو اپنے افسانوں سے ملا کر نیا رنگ دیا ہے۔اس کی چند مثالیں دیکھیے:

''بس اسی وقت سے ڈاکٹر کریمی لطیف وشیریں خواب دیکھنے لگے۔جیسے کوئی ہونہار طالب علم امتحان کے یقینی نتیجے کو سننے کے لیے ایک خوشگوار بے قراری محسوس کرتا ہو۔''(افسانہ تاخیر،منظر وپس منظر،ص۔144)

''اس کے آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کی حرکت سے زندگی شوربختی اور ناسازگاری کے واقعات،تمناؤں کی محرومی کے حادثات،اجل کی چیرہ دستیوں کے سانحات میرے قلب پر اس طرح منعکس ہو رہے تھے جیسے کسی المیہ قصے کے فلم سے تصویریں پردۂ فلم پر منعکس ہوتی ہیں۔''

(افسانہ سینی ٹوریم کا فقیر،منظر وپس منظر،ص۔174-175)

''اس کے تصور میں ہلالِ عید اس لب کی طرح تھا جو طنز کرتے وقت کج وخم ہو جاتا ہے''

(افسانہ تاخیر،منظر وپس منظر،ص۔144)

''اسے دیکھ کر عام طور پر ایسا احساس ہوتا تھا جسے پکے ہوئے سیب یا بھری بوتل کو دیکھ کر ہوتا ہے۔''

(افسانہ یہ دنیا،منظر وپس منظر ص۔198)

''وہ اپنی آئندہ کامرانی حقیقتوں کی تفصیل سے اپنے تخیل وتصور کو اس طرح روک رہے تھے جسے کوئی بلی چوہے کو پکڑ پکڑ کر چھوڑ دیتی ہو یا کوئی بچہ اپنی مرغوب مٹھائیوں کو مچل مچل کر کھاتا ہو۔''

(افسانہ تاخیر،منظر وپس منظر،ص۔144)

اختر اورینوی کے افسانوں کو پڑھ کر شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پسند افسانہ نگار تو ہے لیکن وہ حقیقتوں کو تلخ گردانتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے انھیں حقیقت سے بیزاری ہو۔انھوں نے اپنے افسانوں میں حقیقت کو درد کی وجہ کہا ہے اور تخیل کی اُڑان کو اس درد سے نجات کا راستہ قرار دیا ہے۔اس کی وجہ ان کی خود کی زندگی ہو سکتی ہے۔خیر ان کے افسانوں سے چند مثالیں دیکھئے جنھیں دیکھ کر ان کی حقیقت سے مایوسی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور ان کے کرب کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے:

''زہرہ! بے روزگاری!..........آہ مگر حسن کی رعنائیوں سے کتنی زیادہ اہم زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں۔''

(افسانہ آخری اکنی،منظر وپس منظر،ص۔27)

''اس دنیا میں ہم جان بوجھ کر فریب کھاتے ہیں کیونکہ حقیقت تلخ ہوتی ہے۔''

(افسانہ بے بس،منظر وپس منظر،ص۔64)

''اس طرح نوجوان وکیل کی آرزوؤں پر شکستہ ہو کر تلخ حقیقتوں کے دل میں آگری تھیں۔''

(افسانہ جونیئر،منظر وپس منظر،ص۔68)

''سچ بھی بڑی بری چیز ہے۔تلخ نکیلی،اندر گھسنے والی۔''

(افسانہ ممتا،کیچلیاں اور بال جبریل،ص۔54)

حوالے اور ماخذ

1 اختر اورینوی،منظر وپس منظر،1940،مکتبہ اردو،لاہور

2 اختر اورینوی،کلیاں اور کانٹے،1941،مکتبہ اردو،لاہور

3 اختر اورینوی،کیچلیاں اور بال جبریل،1960،ساتھی بک ڈپو،پٹنہ

4 ارشد مسعود ہاشمی،اختر شناسی،2008 کتابستان پرنٹرس،مظفرپور

5 ایس.ایم حسین،اختر اورینوی،2004،ساہتیہ اکادمی

6 خلیل الرحمٰن اعظمی،اردو میں ترقی پسند تحریک،1994،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ

7 عبد المغنی (مرتب)،اختر اورینوی کے افسانے،1977،بہار اردو اکادمی،پٹنہ

❑❑❑

Tabassum Ara
VillageRudalpur
Post Jalalpur Bazar
District Saran,Chapra 841412(Bihar)

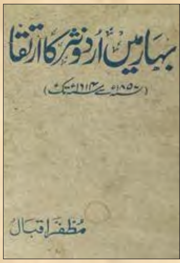

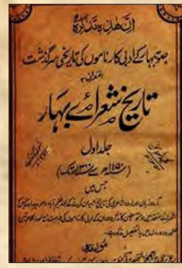

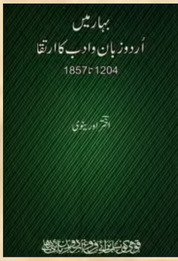

شگفتہ پروین

بہار میں ادبی تاریخ نویسی

تذکرے تحقیق، تنقید، تدوین اور ادبی تاریخ نویسی کے ادھ پکے سرمائے ہیں۔ یہی تذکرے آگے چل کر ادبی تاریخ نویسی کے پیش رو ثابت ہوئے۔ تذکروں میں عام طور پر شعرا اور ادبا کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے کیا جاتا تھا۔ 1880 میں تذکرہ نگاری کے فن میں ایک انقلاب آتا ہے اور 'آب حیات' جیسی کتاب منظر عام پر آتی ہے جس میں مغربی علوم وفنون سے استفادہ کیا گیا اور ایک ایسا انوکھا طریقہ تلاش کیا گیا، جس کی تقلید مدتوں اردو تذکرہ نگار کرتے رہے۔ 'آب حیات' نے بہار کی اردو تذکرہ نگاری پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ صفیر بلگرامی کی تالیف 'جلوہ خضر' میں اس کے رنگ و آہنگ صاف نظر آتے ہیں۔ تاریخی ادوار کا التزام سب سے پہلے 'آب حیات' میں کیا گیا، مگر مکمل ادبی تاریخ بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں 'گل رعنا' اور 'شعر الہند' جیسے تذکرے منظر عام پر آئے۔

بہار میں ادبی تاریخ نویسی کی ابتدا 1931 میں ہوئی، جب عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی (وفات 1935) نے 'تاریخ شعرائے بہار' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ انھوں نے اس کتاب میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ اور اردو کی وجہ تسمیہ پر گفتگو ضرور کی ہے لیکن یہ کتاب ادبی تاریخ نویسی کے زمرے میں نہیں رکھی جاسکتی بلکہ اس کی نوعیت تذکرے کی ہے اور شعرا کی ترتیب بھی الفبائی کے اعتبار سے کی گئی ہے، ہاں، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے 'آب حیات' سے متاثر ہو کر تاریخی ادوار کی رعایت کی ہے اور متقدمین اور متوسطین کے ذیل میں شعرا کی تقسیم کی ہے اور ہر دور کے شعرا کو حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیا ہے۔ چنانچہ پہلا دور متقدمین شعرائے بہار 1150ھ 1738 تا 1200ھ/ 1786، دوسرا دور طبقہ متقدمین 1201ھ/ 1787 تا 1250ھ/ 1835، تیسرا دور طبقہ متوسطین 1251ھ/ 1836 تا 1300ھ/ 1883 قائم کر مصنف نے ہر دور کے شعرا کا ذکر کیا ہے۔ گویا یہ کتاب 1738 سے 1883 تک بہار کی اردو شاعری کا احاطہ کرتی ہے اور شعرائے بہار کے ادبی کارناموں کی تاریخی سرگزشت کو پیش کرتی ہے۔ مصنف نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ بہار میں اردو شاعری کی ابتدا کب ہوئی، البتہ انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ پہلی جلد میں 1150ھ 1738 سے 1200ھ 1786 تک بہار کے اردو شعرا شامل ہیں، لیکن یہ واضح نہیں کیا ہے کہ 1150ھ میں بہار کے کس شاعر نے شاعری کی ابتدا کی۔ اگر وہ زمانی اعتبار سے شاعروں کی ترتیب رکھتے تو اس کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ ایسی صورت میں 1150ھ کی تاریخ طے کرنا کسی اعتبار سے مناسب نہیں۔

ابتدا میں مصنف نے اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بڑی تحقیق سے لکھی ہے اور بہار کے تعلق سے پالی زبان کے اثرات کا ذکر بھی خوب کیا ہے اور اسی تحقیق کی روشنی میں انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو زبان کی اصل سرواسنی بھاشا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو دو

حصوں میں منقسم کیا تھا۔ دوسرے حصے میں 1301ھ/1884 سے 1350ھ/1932 تک صوبۂ بہار کے چار سو شعرا کا تذکرہ نمونہ کلام کے ساتھ درج کیا گیا تھا۔ دوسرے حصے میں انھوں نے عظیم آباد کی اردو شاعری کے تعلق سے ایک اہم تحقیق پیش کی تھی کہ عظیم آباد کا اردو شاعری کے کس اسکول سے تعلق رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ مصنف کے انتقال کے سبب یہ دوسرا حصہ منظر عام پر نہیں آسکا۔ مصنف نے اپنے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ ”بہ جمیع الوجود یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس استغراق و جامعیت اور تاریخی صحت کے ساتھ شعرائے عظیم آباد و صوبہ بہار کا کوئی اس سے جامع و مکمل تذکرہ اس کے پیشتر موجود نہ تھا“۔ مصنف کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ 1931 میں صوبہ بہار کے سات سو شعرا کی تفصیل نمونہ کلام کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ انھوں نے اسے تاریخی شکل دینے کی کوشش ضرور کی، لیکن وہ اس کام کامیاب نہ ہوسکے۔ بہر حال اس کتاب کو بہار میں ادبی تاریخ نویسی کے اولین نقش کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔

”24 دسمبر 1916 کو آل انڈیا اردو کانفرنس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی جی، موتی لعل نہرو، مدن موہن مالویہ اور مہاراجہ محمودآباد جیسے ہندستان کے اکابر شریک ہوئے۔ ان کی موجودگی میں نصیر حسین خیال عظیم آبادی (1880-1934) نے اردو زبان کے تعلق سے ایک دلچسپ تقریر کی جو کافی پسند کی گئی۔ ان کی تقریر سے متاثر ہوکر لوگوں نے اصرار کرنا شروع کردیا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے۔ چنانچہ داستانِ اردو کے عنوان سے انھوں نے اردو کی مکمل ادبی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے ابواب بھی طے کر لیے تھے۔“

24 دسمبر 1916 کو آل انڈیا اردو کانفرنس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی جی، موتی لعل نہرو، مدن موہن مالویہ اور مہاراجہ محمود آباد جیسے ہندستان کے اکابر شریک ہوئے۔ ان کی موجودگی میں نصیر حسین خیال عظیم آبادی (1880۔1934) نے اردو زبان کے تعلق سے ایک دلچسپ تقریر کی جو کافی پسند کی گئی۔ ان کی تقریر سے متاثر ہوکر لوگوں نے اصرار کرنا شروع کردیا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے۔ چنانچہ داستانِ اردو کے عنوان سے انھوں نے اردو کی مکمل ادبی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے ابواب بھی طے کرلیے تھے۔

ان کا ارادہ چونتیس ابواب میں داستانِ اردو کو مکمل کرنے کا تھا اور ہر باب کا موضوع بھی متعین کرلیا تھا اور اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس پر کام بھی شروع کردیا۔ جب کوئی حصہ مکمل ہوجاتا تو اسے کسی رسالے میں شائع کرادیتے۔ اسی داستان اردو کا ایک حصہ 'مغل اور اردو' کے نام سے 1933 میں شائع ہوا اور 1979 سے پہلے داستان اردو کے تعلق سے جو بھی مضامین شائع ہوئے، انھیں کتابی شکل دی گئی اور یہ کتاب داستان اردو کے نام سے ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ نصیر حسین خیال عظیم آبادی نے جو ابواب متعین کیے تھے، وہ سارے ابواب مکمل نہیں کرپائے اور ان کی یہ داستان اردو نامکمل رہ گئی۔ ان کے مطابق تیئیسواں باب بہار کے لیے مختص تھا اور اس باب میں وہ جن جن نکات کو پیش کرنا چاہتے تھے، اس کی تفصیل مغل اور اردو، ضمیمہ بعنوان مجمل فہرست مضامین داستان اردو، ص 8 پر مذکور ہے۔ بدقسمتی سے مذکورہ بالا باب تحریر میں نہیں آسکا۔ اگر یہ کتاب مصنف کے منصوبے کے مطابق تیار ہوجاتی تو خاصے کی چیز ہوتی۔ خاص طور سے صوبہ بہار کی اردو خدمات کے تعلق سے ایک بنیادی تحقیق آزادی سے قبل منظر عام پر آجاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو بعد کے زمانے میں صوبہ بہار کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوتا۔ چونکہ داستان اردو کا سب سے اہم حصہ 'مغل اور اردو' تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر جمیل مظہری نے مناسب سمجھا کہ اس کو کتابی شکل میں پیش کردیا جائے تاکہ اس کا استفادہ عام ہوسکے۔ جیسا کہ اوپر

مذکور ہوا کہ 'مغل اور اردو' 1933 میں شائع ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی نے داستان اردو کی ترتیب کا جو کام 1916 میں شروع کیا تھا، وہ 1933 کے بعد تک جاری رہا اور 1934 میں ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا اور ان کی داستانِ اردو نامکمل رہ گئی۔ پھر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ نواب صاحب نے بڑی تحقیق سے اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کی ہے اور مغل حکمرانوں کی اردو سے دلچسپی کو شواہد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو ادبی تاریخ نویسی کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

1950 میں قاضی عبدالودود نے ادبی تحقیق کو ایک ایسا معیار عطا کیا جس کا اثر پوری اردو آبادی میں دیکھا گیا اور انھیں کی کوششوں سے ادبی تحقیق کا ایک مضبوط سلسلہ بہار میں شروع ہوا۔ اس وقت تک بہار کی ادبی تاریخ اس پیمانے پر مرتب نہیں کی گئی تھی جسے صحیح معنوں میں ادبی تاریخ کا نمونہ کہا جاسکے۔ اختر اورینوی کو اس کا شدت سے احساس تھا۔ گرچہ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے لیکن اس دور میں ان سے بہتر کوئی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بہار میں اردو زبان و ادب کی پیش رفت کو جدید تحقیق کی روشنی میں پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کا یہ منصوبہ 1957 میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ان کے منصوبے کا عملی نمونہ 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا 1204 تا 1857' کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

معین الدین دردائی 1936 میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بی اے آنرس کے طالب علم تھے تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ہدایت پر انھوں نے بہار میں اردو شاعری پر ایک تحقیقی مقالہ رقم کیا جو سالنامہ سہیل میں شائع ہوا۔ اردو دنیا میں اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اس وقت دردائی صاحب کو یہ خیال آیا کہ کیوں نہ مزید تحقیق کے ساتھ اسے کتابی شکل دی جائے، لیکن وہ وقت نہ نکال سکے اور جب 1947 میں ان کا یہ مقالہ معاصر میں قسط وار شائع ہوا تو مزید تاخیر کی گنجائش نہ رہی اور مزید ترمیم و اضافہ کے بعد 1947 میں اسے کتابی شکل دی گئی۔ ابتدا میں انھوں نے بہار میں اردو شاعری کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے، بعدہ چار ادوار میں شعرا کی تقسیم کی گئی ہے، چنانچہ دور متقدمین میں 11 شعرا، دور متوسطین میں 25 شعرا، دور متاخرین میں 14 شعرا اور دور حاضر میں 27 شعرا کے احوال اور نمونہ کلام درج کیے گئے ہیں اور ہر دور کے آغاز میں اس عہد کی شاعری کی خصوصیات مختصر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ شعرا کے بیان میں مصنف نے سنین کا اہتمام بہت کم کیا ہے اور نہ چاروں ادوار کی تاریخ متعین کی گئی ہے۔ تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب ذرا کمزور نظر آتی ہے۔ تاہم جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی، اس لحاظ سے لائق ستائش ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ کتاب اس وقت کی ایک اہم تحقیق تھی اور آج بھی اسے ماخذ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب ابتدا سے 1857 تک بہار کی ادبی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں شعر و نثر دونوں مباحث پیش کیے گئے ہیں۔ اختر اورینوی کی یہ کتاب مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں انھوں نے فلسفۂ زبان و اقوام، اردو زبان کے آغاز کا پس منظر اور اردو زبان کے ارتقا پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ باب اول میں بہار میں اردو زبان؛ عہد عالمگیری میں لسانی یکسانی، کھڑی بولی ریختہ، قدیم اردو اور صوفیائے کرام اور انگریزی دور میں اردو زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم میں بہار میں اردو ادب؛ بہار میں اردو شاعری، بہار کے تذکرہ نگار شعرا، شعرائے شاہجہاں آباد جو عظیم آباد میں آباد ہوئے، بہار میں اردو نثر نگاری، بہار میں اردو ادب کے عام میلانات پر تفصیلی گفتگو کر کے اردو زبان و ادب میں بہار کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اختر اورینوی نے پہلی بار بہار کی اردو نثر نگاری پر قلم اٹھایا اور 1801 سے 1857 تک بہار کی اردو نثر کے ابتدائی نمونوں کا مفصل جائزہ لیا۔

قاضی عبدالودود نے اس کتاب کا ہر پہلو سے تفصیلی جائزہ لیا تھا اور ان کے اس تبصرے کو مثال کے طور پر پیش بھی کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے تبصرے میں اختر اورینوی کو ایک ناکام محقق کے طور پر پیش کیا تھا۔

اختر اورینوی کی اس تحقیق کو مظفر اقبال اور کلیم عاجز نے آگے

بڑھایا۔ چنانچہ مظفر اقبال نے بہار میں اردو نثر کا ارتقا:1857 سے 1914 تک اور کلیم عاجز نے بہار میں اردو شاعری کا ارتقا:1857 سے 1914 تک کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔مظفر اقبال کی کتاب 1980 میں شائع ہوئی۔ انھوں نے متعلقہ عہد میں بہار کی اردو نثر کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا ہے اور اس کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے اور مختلف مذہبی تحریکات کے زیر اثر بہار میں اردو نثر کی ترقی، صحافت و دیگر نثری تحریریں؛ تاریخ، تذکرہ، سیرت النبیؐ، سوانح عمری، آپ بیتی، سفرنامہ، طب، قانون، جغرافیہ، ریاضیات، سائنس، فلسفہ، اخلاق، تعلیم، ادبی نثر؛ داستانیں، تمثیلی قصے، ناول، ڈراما، تنقید، ادبی ولسانی تحقیقات، لغات، تاریخ ادب، تذکرے، ادیبوں کی سوانح عمریاں، لسانیات اور قواعد کا مطالعہ کر کے ساری اصناف کا خاصی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اختر اورینوی کی ادبی تاریخ کے مقابلے میں مظفر اقبال کا تحقیقی معیار زیادہ بلند ہے اور بہار کی یہی ایک کتاب ہے جو ادبی تاریخ نویسی کے معیار پر کھری اترتی ہے۔صفدر امام قادری نے بہار کی ادبی تاریخ نویسی کے سلسلے میں اسی کتاب کو اپنے موضوع کے ساتھ پورے طور پر انصاف کرنے والی بتایا ہے (نئی پرانی کتابیں، صفحہ 101)۔

''جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کلیم عاجز کی تحقیق 1857 کے بعد بہار میں اردو شاعری سے متعلق ہے۔ان کی یہ تحقیق 'دفتر گم گشتہ: بہار میں اردو شاعری کا ارتقا' کے نام سے 1998 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں ثقافت، زبان، ادب، تاریخی پس منظر، اخلاقی اور مذہبی پس منظر، سماجی اور تعلیمی پس منظر، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا اور باب دوم میں 48 شعرا کے احوال، انتخاب کلام اور کلام پر تنقید کے ذریعے 1857 کے بعد سے 1914 تک بہار میں اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے، لیکن ان کی یہ تحقیق اختر اورینوی اور مظفر اقبال کی بہ نسبت نہایت کمزور ہے کیونکہ انھوں نے تحقیق پر کم اور انشاپردازی پر زیادہ زور لگایا ہے۔''

حالانکہ ان کا دعوی ہے کہ ان کی اس تحریر کو پڑھتے ہوئے جمیل مظہری کبھی آبدیدہ بھی ہوتے اور فضل حق آزاد کے صاحبزادے عزیز عظیم آبادی تو ایک مقام پر دیر تک سسکیاں لیتے رہے۔ادبی تاریخ نویسی کے باب میں بہار کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی سرزمین پر ادبیاتِ عالم کی تاریخ سات جلدوں میں مرتب کی گئی۔اس قسم کے ادبی کام کو انجام دینے کی جرأت اس سے پہلے کسی نے نہیں دکھائی۔ اس معاملے میں بہار کو اولیت حاصل ہے۔اس کا فریضہ عہد حاضر کے بڑے ناقد وہاب اشرفی نے ادا کیا۔مقصد تھا کہ عالمی تاریخ میں لوگوں کی دلچسپی پائی جاتی ہے لیکن ادبیاتِ عالم کی تاریخ سے کوئی شغف نہیں رکھتے، جبکہ کسی زبان کو ارتقا اور عروج کی بلندی تک پہنچانے کے لیے دیگر عالمی زبانوں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔اگر عالمی ادب کی کارگزاریاں اور اس کی تخلیقی و تحقیقی پیش رفت سے آگاہی ہوتی رہے تو اس کے مثبت نتائج سے زبان و ادب نکھرنے لگتے ہیں۔اسی مقصد کو سامنے رکھ کر وہاب اشرفی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور سات جلدوں میں اسے مکمل کیا۔ایسے کام ادارے کیا کرتے ہیں، وہ بھی ٹیم بنا کر، یہاں ایک فرد واحد نے یہ کارنامہ کر دکھایا، اس کے لیے وہاب صاحب کی جتنی ستائش کی جائے، کم ہے۔انھوں نے ان سات جلدوں میں دنیا کی عظیم زبانوں اور ادبیات: مصری، اشوری، یونانی، چینی، عبرانی، کیلٹی، ہسپانوی، لاطینی، سنسکرت، پالی، فرانسیسی، جرمن، امریکی، اسکینڈ نیویائی، عربی، فارسی، تامل، ڈنمارک، اطالوی، روسی، سویڈی، پرتگالی، ڈچ، پنجابی، مراٹھی، بنگالی، ہندی، اردو، ترکی، ملیالم، کنڑ، تیلگو ادبیات کا تعارف وخصائص اور اس کی تاریخ پیش کی ہے۔33 زبانوں کا مطالعہ کرنا اپنے آپ میں بڑی بات ہے چہ جائیکہ اس کے تعارف، خصائص اور تاریخ پر روشنی ڈالی جائے۔

2024 میں شاہ حسین احمد کی کتاب 'بہار میں اردو ادب کا ابتدائی زمانہ' شائع ہوئی۔اس میں انھوں نے ابتدا سے 1857 تک بہار میں اردو نثر و نظم کے آغاز وارتقا سے بحث کی ہے اور 67 شعرا کے احوال اور نمونہ کلام درج کیے ہیں۔ دراصل ان کا ارادہ تین جلدوں میں بہار کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کا ہے اور یہ اس کی پہلی جلد ہے۔'حرف اول' میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مکمل تاریخ ادب اردو بہار تین جلدوں میں لکھنے کا ارادہ ہے۔پہلی جلد ابتدا سے 1857 تک، دوسری 1858 سے 1947 تک اور تیسری 1948 سے آج تک۔ پہلی جلد ''بہار میں اردو ادب کا ابتدائی زمانہ'' حاضر خدمت ہے (ص9)۔''

شاہ حسین احمد نے اپنی ادبی تاریخ کی پہلی جلد کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے: باب اول۔ بہار میں اردو نثر 1857 تک، باب دوم۔ بہار میں اردو شاعری 1700 تک، باب سوم۔ بہار میں اردو شاعری 1701 سے 1800 تک اور باب چہارم۔ بہار میں اردو شاعری 1801 سے 1857 تک۔ اس سے قبل بہار کی قدیم ادبی تاریخ کے تعلق سے تین کتابیں؛ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا: 1857 تک مؤلفہ اختر اورینوی، بہار میں اردو شاعری کا ارتقا: 1857 سے 1914 تک مؤلفہ کلیم عاجز اور بہار میں اردو نثر کا ارتقا: 1857 سے 1914 تک مؤلفہ مظفر اقبال لکھی جا چکی تھیں، جن میں سے اختر اورینوی اور کلیم عاجز کی تحقیق کو یہ کہہ کر شاہ حسین نے مسترد کر دیا ہے کہ ایک افسانہ نگار ہے اور دوسرا شاعر اور دونوں میں تحقیق کا مادہ مطلق نہ تھا، مگر مظفر اقبال کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

> ”کلیم عاجز کے تعلق سے ان کے خیال کی تائید کی جاسکتی ہے کیونکہ انھوں نے ادبی تحقیق کو انشاپردازی کا نمونہ بنادیا ہے۔ البتہ اختر اورینوی کے سلسلے سے ان کی رائے تسلیم نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اگر ان میں تحقیق کا مادہ مطلق نہ تھا تو اس وقت جب بہار میں ادبی تاریخ کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا، اپنی ادبی تاریخ کو اس سلیقے سے مرتب نہیں کرتے۔ پہلی اینٹ رکھنا اپنے آپ میں بڑی بات ہوتی ہے۔“

کلیم عاجز کے تعلق سے ان کے خیال کی تائید کی جاسکتی ہے کیونکہ انھوں نے ادبی تحقیق کو انشاپردازی کا نمونہ بنا دیا ہے۔ البتہ اختر اورینوی کے سلسلے سے ان کی رائے تسلیم نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اگر ان میں تحقیق کا مادہ مطلق نہ تھا تو اس وقت جب بہار میں ادبی تاریخ کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا، اپنی ادبی تاریخ کو اس سلیقے سے مرتب نہیں کرتے۔ پہلی اینٹ رکھنا اپنے آپ میں بڑی بات ہوتی ہے۔ اختر اورینوی کی ادبی تاریخ میں تحقیقی اور تاریخی لغزشیں پائی جاتی ہیں، اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا اور جس کی طرف قاضی عبدالودود نے اشارہ بھی کیا ہے، لیکن ان کی کاوش کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

شاہ حسین کی اس ادبی تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نو نثری کتابوں: فوائد المریدین مؤلفہ شرف الدین یحیٰ منیری، ہدایت الجاہلین مؤلفہ عاجز عظیم آبادی، جواز مجلس مولود مؤلفہ شاہ احمد حسین، اپنے دیکھنے کا آئینہ مؤلفہ حسن علی سہسرامی، قصہ گلزار مؤلفہ عنایت حسین خاں مہجور، گلشن فصاحت مؤلفہ وارث علی اشکی، نجم الہدایت مؤلفہ آل حسنین پھلواروی، عملیات و تعویذات اور شرح محمدی کا اضافہ کیا ہے جن کا ذکر اختر اورینوی اور مظفر اقبال کی ادبی تاریخوں میں نہیں ہے۔ ان نو کتابوں میں شروع کی سات کتابیں خدا بخش لائبریری اور بقیہ دو کتابیں خانقاہ شاہ ارزانی میں محفوظ ہیں۔ اردو اشعار کے تعلق سے بھی انھوں نے کچھ نئے اشعار کی تلاش کی ہے اور اس کی صحت پر دلائل پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی موزوں، عماد، سجاد، خفا، عشقی اور فگار کے سلسلے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ ان کی شاعری کی نسبت سے جو اشعار پیش کیے جاتے ہیں، اس کے شواہد نہیں ملتے۔ اس اعتبار سے شاہ حسین کی کوشش لائق تحسین ہے اور امید ہے کہ بقیہ جلدوں میں بھی ان کی یہی تحقیقی شان نظر آئے گی۔

❑❑❑

Shagufta Perween

Karamganj,

Near Jai Hind Nursery

Gulzar Beg Manzil,

Near Akhtar Lungi House

Darbhanga-846004(Bihar)

Email: perweenshagufta08@gmail.com

ثوبیہ رفیق

اردو صحافت میں کالم نویسی کی اہمیت

کالم نویسی سے مراد وہ تحریر ہے جو کسی اخبار یا رسالے میں مستقل عنوان کے تحت شائع ہوتی ہے جس کا مقصد عصری علوم یا مسائل پر تبصرہ کرنا ہے۔ کالم انگریزی زبان کے لفظ 'COLUMN' سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی کھمبا، مینار اور ستون کے ہیں۔ کالم نویسی ایک ایسی صحافتی اصطلاح ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں مستقل عنوان کے ساتھ ہلکے پھلکے انداز میں لکھی جاتی ہے۔ کالم نویسی بھی ایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اپنے فنی تقاضے ہیں۔ باقی اصناف صحافت کے مقابلے عوام میں کالم نویسی اپنے منفرد اسلوب اور موضوعات کی وجہ سے مقبول ہے۔ ایک کالم نگار کے لیے کالم نویسی خیالات کے اظہار کا ایک عمدہ اور پُر تاثر وسیلہ ہے۔ کالم نویس کا مقصد عام طور پر تعلیمی ،فکری معاشرتی ،اقتصادی اور سیاسی موضوعات پر رائے دینا اور تبادلۂ خیال کرنا ہوتا ہے۔ اس میں ایک کالم نگار معاشرتی تصویر کشی کر کے اپنے خیالات ،نظریات اور فکر کے ذریعے اس تصویر کو علمی زبان عطا کرتا ہے۔ اُسے معاشرے میں جو دکھائی دیتا ہے وہ اس پر غور وفکر کرتا ہے اور پھر اپنے تجربات ،مشاہدات اور نظریات کی روشنی سے معاشرے اور اس میں ہونے والے تمام افعال کو الفاظ کی تصویر پہناتا ہے۔ پروفیسر شفیق جالندھری کالم کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

'کسی مستقل عنوان کے تحت اخبار یا رسالے میں باقاعدہ شائع ہونے والی تحریر کو کالم کہتے ہیں جو عموماً لکھنے والے کے نام کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔'1

(اردو کالم نویسی، پروفیسر شفیق جالندھری، اے ون پبلشرز، 1993، ص 23)

کالم نویسی کے ذریعے عصری مسائل کے کسی بھی مسئلے کی وضاحت کالم نویس اس طرح کرتا ہے کہ قارئین کو ان مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کالم نویسی میں موضوعات کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس کے موضوعات اس قدر وسیع ہیں کہ سیاسی وسماجی حوالوں سے لے کر تہذیبی ،ثقافتی اور اخلاقی قدریں کالم نگاری کے موضوعات ہو سکتے ہیں لہٰذا اس کی ہمہ گیر وسعت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایک کالم نویس کو کالم لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کالم واضح طور پر لکھیں جائیں۔ مبہم اور تکنیکی زبان سے اپنے کالم کو پیچیدہ اور مشکل نہ بنائیں، جتنا ہو سکے اپنی تحریر کو سادہ اور سلیس رکھیں۔ مختصر جملے اور پیراگراف کا استعمال کریں۔ اپنے کالم کے لیے ایسے عنوانات منتخب کریں جہاں آپ لوگوں کے مسائل کے بارے میں لکھ سکیں۔ عوام کے سیاسی ،سماجی ،معاشی ،تعلیمی مسائل کے ساتھ

ساتھ کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات کو بھی کالم میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس سے آپ کا کالم دلچسپ اور پُر تاثیر ہوگا۔ جب کالم نویسی میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا جائے گا تو کالم قارئین کی توجہ کا مرکز بنے گا۔ کالم جہاں معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی، معلومات کی فراہمی اور فکری رہنمائی کا مقصد پورا کرتے ہیں وہیں رائے عامہ کی تشکیل اور مسائل کے حل میں بھی مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ آج کی جدید صحافت کا اہم حصّہ بن چکا ہے۔ اس کے بغیر کوئی اخبار مکمل نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ کہ کالم نویسی کے بغیر ایک اچھے اخبار یا رسالے کے بارے میں سوچا نہیں جاسکتا۔ اخبارات ورسائل کی ترقی کا دارومداران میں لکھے گئے کالموں اور اداریوں پر منحصر ہوتا ہے۔ کالم کو اداریے کا متبادل کہا جاسکتا ہے۔ کالم اور اداریے میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ کالم ہلکے پھلکے اور غیر رسمی انداز میں لکھے جاتے ہیں جبکہ اداریے میں سنجیدہ اور مدلّل طریقے کو اپنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اداریے میں اداریہ نگار ایک عمدہ اور بہترین تحریر لکھ کر بھی گمنام رہتا ہے مگر اس کے برعکس کالم نگاری کالم نویس کے نام کے ساتھ لکھی جانے والی صحافتی اصطلاح ہے۔

”اردو صحافت میں کالم اپنے منفرد اسلوب اور طرز نگارش کی وجہ سے بے حد مقبول ہے۔ عام طور پر کالموں کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں رنگ برنگے کالم، ذاتی کالم، سنڈیکیٹ کالم، مزاحیہ کالم اور خصوصی کالم قابل ذکر ہیں۔“

اردو صحافت میں کالم اپنے منفرد اسلوب اور طرز نگارش کی وجہ سے بے حد مقبول ہے۔ عام طور پر کالموں کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں رنگ برنگے کالم، ذاتی کالم، سنڈیکیٹ کالم، مزاحیہ کالم اور خصوصی کالم قابل ذکر ہیں۔ رنگ برنگے کالموں میں موضوعات کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس میں ایک کالم نویس کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع کو زیر بحث لائے۔ ذاتی کالم میں ایک کالم نویس کی گہری چھاپ دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنی بات نہایت ہی دلائل اور منطقی انداز میں بیان کرتا ہے۔

پیسوں سے خریدے جانے والے کالم سینڈیکیٹ کہلاتے ہیں۔ مزاحیہ کالم میں ہلکے پھلکے انداز اور طنز مزاح کی چاشنی سے قارئین کو کسی بھی اہم مسئلے کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اردو کے مشہور اخبار 'اودھ پنچ' میں لکھے گے کالم اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ کسی خاص موضوع پر لکھے جانے والے کالم خصوصی کالم کہلاتے ہیں مثلاً کھیل کود، موسیقی، فوٹوگرافی، علم وادب، ماحولیات، صنعت وحرفت اور طب وغیرہ پر لکھے جانے والے کالم خصوصی کالم کے زمرے میں آتے ہیں۔ کالم نگاری کا آغاز امریکہ میں اٹھارویں صدی کے آواخر میں جریدہ 'ویکلی میوزم' میں جوزف ڈینی کے ہاتھوں ہوا۔

اُردو میں کالم نویسی کے ابتدائی نقوش اُردو کے پہلے اخبار 'جامِ جہاں نما' سے ہی ملنے شروع ہوجاتے ہیں جو 27 مارچ 1822 میں شروع ہوا تھا۔ 1836 میں مولوی محمد باقر نے 'دہلی اخبار' نکالا اور 1837 میں سر سید احمد خان کے بھائی سید محمد خان نے 'سیدالاخبار' جاری کیا۔ اس کے علاوہ اس دور کے دیگر اخبارات ورسائل میں 'فوائد الناظرین'، 'صادق الاخبار'، 'کوہِ نور'، 'قرآن السعدین' وغیرہ کی خبروں میں کالم نویسی کے ابتدائی نقوش ہیں۔ 'فوائد الناظرین' 1845 میں جاری کیا گیا جس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر تھے۔ 'صادق الاخبار' فارسی ہفتہ وار اخبار جو دہلی سے 1854 میں جاری کیا گیا۔ 'کوہِ نور' ہفتہ میں دوبار شائع لاہور سے 1850 میں جاری ہوا جس کے ایڈیٹر ہرسکھ لال رائے تھے۔ 'قرآن السعدین' اخبار دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الوائس اپرنگر کی سرپرستی میں 1845 میں شائع ہوا۔ پنڈت دھرم نرائن ہاسکر اس کے ایڈیٹر تھے۔

1858 میں منشی نول کشور کے 'اودھ اخبار' کے شروع ہونے سے اُردو صحافت نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس اخبار نے اُردو صحافت کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ یہ اخبار ایک لمبے عرصے تک زندہ رہا۔ ان نامور ادیبوں میں مفتی امیر اللہ تسلیم، مولوی، غالب، مولانا جالب دہلوی، غلام محمد تپش، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی احمد حسن شوکت، عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ 'ظرافت' کے عنوان سے پنڈت رتن ناتھ سرشار اس اخبار میں

مضامین لکھتے تھے جنھیں ابتدائی نوعیت کے کالم بھی کہا جا سکتا ہے۔ لکھنو کی تہذیب و معاشرت کی سرشار نے اپنے مضامین اور اس اخبار میں شائع ہونے والے ناول 'فسانہ آزاد' میں بہترین عکاسی کی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب تبصرے مضامین کی شکل اختیار کر رہے تھے اور مضامین کالم، اداریوں اور فیچر کی صورت میں لکھے جا رہے تھے۔ اس کے بعد سر سید احمد خان نے اُردو میں علمی و ادبی صحافت کا آغاز کیا۔

1866 میں سر سید نے 'اخبار سائنٹیفک سوسائٹی' جاری کیا جس سے اُردو میں سادہ اور سلیس نثر لکھنے کا رواج عام ہوا۔ اخبار کا ایک کالم اردو زبان میں ہوتا تھا تو دوسرا کالم انگریزی میں۔ اس اخبار کے ذریعے سر سید نے ہندوستانیوں کے حالات و واقعات کو برطانوی حکومت تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

"اردو صحافت کی تاریخ میں سر سید احمد خان کی خدمات نہایت ھی معتبر اور قابل قدر ھیں 1870 میں سر سید نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کا مقصد سماج میں پائی جانے والی سماجی اور اخلاقی کمزوریوں کی اصلاح کرنا تھا۔ اس رسالے میں سر سید نے مسلمانوں کی فلاح وبهبود کے لیے اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھے۔"

اردو صحافت کی تاریخ میں سر سید احمد خان کی خدمات نہایت ہی معتبر اور قابل قدر ہیں 1870 میں سر سید نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کا مقصد سماج میں پائی جانے والی سماجی اور اخلاقی کمزوریوں کی اصلاح کرنا تھا۔ اس رسالے میں سر سید نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھے۔ سر سید احمد خان مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے خیر خواہ تھے۔ مغربی تعلیم سے ہندوستانیوں کو آشنا کرانے کے لیے سر سید نے اس رسالے میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ انھوں نے اپنے اخبار اور رسالے کے ذریعے مسلمانوں کی جہالت کو دور کرنے کے لیے بلند پایہ کے مضامین لکھے۔

اس کے بعد 'اودھ پنچ' کا دور آتا ہے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ اس اخبار کے ذریعے اُردو میں طنز و ظرافت کا رواج عام ہوا۔ اُردو کالم نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ 'اودھ پنچ' میں لکھنے والوں میں مفتی سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر (جن کو سرشار ثانی کہا جاتا ہے)، جوالا پرشاد برق، نواب سعید احمد اور اکبر الہ آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کی نگارشات سے اُردو ادب میں طنز و ظرافت کے فروغ کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اخبار کے مستقل کالم 'لوکل' اور 'موافقت زمانہ' تھے۔ جن کے ذریعے منشی سجاد حسین اُس دور کے اہم حالات و واقعات پر طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

اودھ پنچ کا ایک ہفتہ وار کالم 'توکل علیہ رحمت' بھی تھا۔ اس میں منشی سجاد حسین نے ایک مضمون 'انڈے بچے والی چیل چلہاڑ' لکھا تھا جو اس دور میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اخبار نے ایک لمبے عرصے تک اردو طنز و مزاح کی خدمت انجام دیں اور آج تک اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کالم جس کی ابتدا خبری کالم نویسی کی شکل وصورت میں ہوئی بیسویں صدی تک آتے آتے اس نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ بیسویں صدی میں اُردو کالم نویسی ایک مستقل عنوان کے تحت کالم نگار کے نام کے ساتھ اخبارات ورسائل میں کی جانے لگی۔

اُردو میں مستقل عنوان اور نئے انداز میں کالم لکھنے کا آغاز 1912 میں ابوالکلام آزاد نے کیا۔ مولانا نے 'الہلال' میں 'افکار و حوادث' کے نام سے ایک شگفتہ کالم لکھنے کی شروعات کی جس میں وہ اُس دور کے سیاسی حالات و واقعات پر بحث کرتے تھے۔ 'افکار و حوادث' کو سنجیدہ کالم نگاری میں لکھا جانے والا پہلا کالم سمجھا جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی اُردو صحافت کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے 'زمیندار اخبار' اور ایک علمی و ادبی روزنامہ جاری کیا تھا جس میں انھوں نے 'فکاہات اور جواہر ریزے' کے عنوانات سے کالم لکھے۔ ان کالموں میں وہ روزمرہ کے واقعات پر لطیف انداز میں تبصرہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دور کے معاشرتی

مسائل کو بھی زیرِ بحث لاتے تھے۔ زمیندار سے منسلک ایک اور بلند پایے کے کالم نگار تھے جن کا نام عبدالمجید سالک تھا جو زمیندار میں 'افکار وحوادث' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ اس دور کا ایک اور قابلِ ذکر اخبار محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' ہے۔ 'کشکول' کے نام سے وہ اس اخبار میں ایک طنزیہ کالم لکھتے تھے۔ ہمدرد کے ایک اور قابلِ ذکر کالم نگار محفوظ علی بدایونی تھے جو 'تجاہلِ عامیانہ' کے عنوان سے اس اخبار میں کالم لکھا کرتے تھے۔ عبدالماجد دریا آبادی کا نام بھی اُردو کالم نگاری کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ 'سچی باتیں' کے مستقل عنوان سے ہفت روزہ سچ، صدق اور صدقِ جدید میں طنزیہ کالم لکھتے رہے۔ اس کے بعد نصر اللہ خاں عزیز کا 'تیر ونشتر اور' سیر وسفر'، چراغ حسن حسرت کا 'کوچہ گرد، مطائبات اور باغ وبہار، حاجی لق لق کا 'تعلق'، مجید لاہوری کا 'حرف وحکایات'، شوکت تھانوی کا 'دو باتیں، حق و باطل، پہاڑ تلے'، ابنِ انشا کا 'باتیں انشاجی کی اور دخل در معقولات'، ابراہیم جلیس کے 'تکلف برطرف، آپ بیتی اور عوام بیتی'، احمد ندیم قاسمی کا 'رواں دواں'، فکر تونسوی کا 'پیاز کے چھلکے'، کنہیا لال کپور کا 'دیکھتا چلا گیا'، جعفر عباس کا 'آئینہ'، خواجہ حسن نظامی کا 'جھینگر کا جنازہ'، شاہد صدیقی کا 'شیشہ و تیشہ'، حیات اللہ انصاری کا 'گلوریاں'، مجتبیٰ حسین کے میرا کالم، شیشہ و تیشہ وغیرہ کالم قابلِ ذکر ہیں۔ آج بھی اردو صحافت کی تاریخ میں ان صحافیوں اور ادیبوں کا نام زندہ جاوید ہے اوران کے لکھے گئے کالموں کا تاثر لوگوں کے دل ودماغ میں آج بھی محفوظ ہے۔ ان صحافیوں کے کالموں میں اس دور کا ایک جیتا جاگتا معاشرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کسی نے معاشرے کے نقائص کو طنزیہ و ظریفانہ انداز میں پیش اور کسی نے نہایت سنجیدہ پیرایہ اختیار کر کے اپنے عہد کی تصویر کشی کی ہے۔

موجودہ سائنس اور آرٹیفشل انٹلیجنس کے دور میں بھی مختلف اخبارات ورسائل میں لکھنے والے کالم نویس اپنے معاشرے اور ملک وقوم کے مختلف مسائل کو کالم نویسی کے ذریعے عوام کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تیز رفتار دنیا میں آج بھی کالم نگاروں کی تحریریں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے جو ان کالموں کو پڑھ کر ملکی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی، سیاسی اور سماجی مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا ہے۔ جیسے کہ اخبار 'انقلاب' کا اجرا عبدالحمید انصاری نے 1938 میں کیا۔ انھوں نے اس اخبار میں 'قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم' کے عنوان سے مستقل کالم لکھ کر اپنے وقت کے معاشرتی مسائل کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس اخبار کے ساتھ جو کالم نگار وابستہ رہے اور وابستہ ہیں ان میں مولانا ندیم الواجدی، حسن کمال، شمیم طارق، پرویز طارق، ڈاکٹر مشتاق احمد، شاہد لطیف، مدثر احمد قاسمی، سعادت خان، حمزہ فضل اصلاحی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

حمزہ فضل اصلاحی 'انقلاب' میں ہر اتوار 'گاؤں کی باتیں' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں جس میں وہ دیہاتی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس اخبار کے مستقل کالم 'ہمہ رنگ' اور 'اوڑھنی' ہیں۔ روزنامہ 'سیاست' کو حیدرآباد سے عابد علی خاں نے 1949 میں جاری کیا تھا۔ 'شیشہ و تیشہ' اس کا مقبول کالم ہے۔ اس کالم کے لکھنے والوں میں مجتبیٰ حسین، شاہد صدیقی اور جیلانی بانو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ 'فکر ونظر' بھی اس اخبار کا مستقل کالم ہے جس میں روزانہ سیاست اور ادب کے متعلق گفتگو ہوتی ہے۔ 'اردو ٹائمز' اخبار 1960 میں ممبئی سے جاری کیا گیا تھا اور ہنوز اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ 'مراسلات' اور 'فکر امروز' کے عنوان سے اس اخبار میں کالم لکھے جاتے ہیں اس اخبار کے ساتھ ہمیشہ بلند پایے کے صحافی جڑے رہے جنھوں نے اس اخبار کے معیار کو ہمیشہ قائم ودائم رکھا۔ ان صحافیوں میں مقبول نیازی، محمد نذیر، شہر یار عابدی، ساجد رشید، شمیم طارق، عالم نقوی، عبدالرحمٰن صدیقی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

□□□

Sobia Rafiq
Research Scholar
Kashmir University
Hazratbal
Srinagar-190006 (Jammu & Kashmir)
E-mail-sobia.urscholar@kashmiruniversity.net

محمد اکمل خان

سائنس کے میدان میں ہندوستانی خواتین کا کردار

آج خواتین زندگی کے ہر میدان میں نئی بلندیوں کو چھو رہی ہیں۔ سائنسی میدان اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ایک عمومی خیال ہے کہ سائنسی ایجادات و اختراعات میں مردوں کا رول خواتین کے مقابلے زیادہ ہے اور عورتوں نے محض فنون، ثقافت اور دیگر انسانی علوم کے شعبوں ہی میں مہارت حاصل کی ہے، تاہم سائنس کے میدان میں اپنی دلچسپی اور عزم کے ذریعے ملک کی متعدد خواتین نے اس خام خیالی کو اپنے کارہائے نمایاں سے غلط ثابت کیا ہے۔ آج ہمارے ملک کی خواتین سائنسداں میزائل پروگراموں سے لے کر دفاعی و خلائی مشینوں، ادویات کی ترقیوں جیسے محاذوں پر کامیابی کی نئی کہانیاں لکھتے ہوئے ملک و دنیا کی ترقی اور سلامتی میں اپنا اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی میں خواتین کی خدمات کے شواہد قدیم تہذیبوں ہی سے ملتے ہیں۔ پدر شاہی نظام (Patriarchy) میں رہنے کے باوجود قدیم دور کی خواتین نے مختلف سائنسی شعبوں کی بنیاد رکھی۔ قدیم میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) اور مصر (Egypt) میں خواتین کاتب کے طور پر خدمات انجام دیتی تھیں اور مندروں کی انتظامیہ میں شامل رہتی تھیں۔ یہ ریاضی اور فلکیات کی ابتدائی ترقی کا حصہ بھی رہی ہیں۔ مصر میں، تقریباً 2700 قبل مسیح میں میرٹ پتاح (Merit-Ptah) جیسی خاتون کو ابتدائی خواتین طبیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تقریباً 350 سے 415 عیسوی میں اسکندریہ کی ہائپیشیا (Hypatia of Alexandria) اگرچہ قبل مسیح کے بعد کی خاتون ہیں، لیکن انھیں قدیم زمانے کی ایک ابتدائی خاتون سائنسداں اور ریاضی داں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم یونان میں اگنوڈائس (Agnodice) نام کی خاتون گزری ہیں جنھیں ابتدائی خواتین طبیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ مرد کا بھیس بدل کر طبی خدمات انجام دیتی تھیں۔ ان کا کردار خواتین کو درپیش سماجی رکاوٹوں نیز سائنس میں ان کے یوگدان کا گواہ ہے۔

جدید دور میں میری کیوری (Marie Curie) نامی ایک ماہر طبیعیات اور ماہر کیمیا نے ریڈیو ایکٹیویٹی (Radioactivity) میں انقلابی دریافتیں کیں۔ وہ نوبل انعام حاصل کرنے والی پہلی اور ایسی واحد سائنسداں ہیں جنھوں نے طبیعیات اور کیمیا کے شعبوں میں الگ الگ نوبل انعامات حاصل کیے۔ ایڈا لولیس (Ada Lovelace) کو پہلی کمپیوٹر پروگرامر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان خواتین نے نہ صرف اپنے متعلقہ شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور خواتین کو سائنس

میں آگے بڑھنے اور مستقبل کو بہتر بنانے کا حوصلہ دیا۔

قدیم ہندوستانی متون، مثلاً وید (Vedas) اور اُپنیشد (Upanishads) میں خواتین اسکالرز اور سائنسدانوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں گارگی واچکناوی (Gargi Vachaknavi) اور میتریی (Maitreyi) جیسی نمایاں فلسفیوں کا تذکرہ آیا ہے جو مابعد الطبیعیات (Metaphysics) اور اپنے وقت کے دیگر علوم پر مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں۔ ہم یہاں ہندوستان کی کچھ اہم خواتین سائنسدانوں کے حالات زندگی اور ان کے سائنسی کارناموں پر روشنی ڈالیں گے۔

جانکی امال (Janaki Ammal):4 نومبر 1897 کو کیرالہ کے کننور ضلع کے ٹیلیچیری (اب تھالاسیری) میں پیدا ہونے والی جانکی امال کو بھارت کی پہلی خاتون نباتات دان (Botanist) ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ 'پدمشری' حاصل کرنے والی ملک کی پہلی خاتون سائنسداں تھیں۔ 1920 سے پہلے بھارت میں گنے (Sugarcane) کی پیداوار اتنی اچھی نہیں تھی، لیکن جانکی امال کی منفرد تحقیق نے دیسی گنے کو مٹھاس سے بھر دیا۔ ڈاکٹر امال کی یہ تحقیق ہندوستانی زراعت (Agriculture) کی ترقی میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔

میری پونن لوکوس (1886–1976): ہندوستان کی طب اور عوامی صحت کے شعبے میں ایک ممتاز سائنسداں گزری ہیں۔ انھوں نے 1912 میں مدراس میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور بعد میں لندن میں زچگی اور امراض نسواں (Gynecology) میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر لوکوس کو 1938 میں تراونکور (آج کا کیرالا) کی پہلی خاتون سرجن جنرل مقرر کیا گیا۔ انھوں نے علاقے میں صحت کی دیکھ بھال کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور پر زچگی اور بچوں کی صحت پر توجہ مرکوز کی اور دائیوں کی تربیتی پروگراموں کا آغاز کیا۔ ان کی قیادت میں، عوامی صحت کے ڈھانچے میں نمایاں ترقی ہوئی، جن میں اسپتالوں اور دیہی صحت کے مراکز کی توسیع شامل ہے۔ پونن لوکوس نے طب کے علاوہ تعلیم اور خواتین کے حقوق کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

جانکی امال (Janaki Ammal): 4 نومبر 1897 کو کیرالہ کے کننور ضلع کے ٹیلیچیری (اب تھالاسیری) میں پیدا ہونے والی جانکی امال کو بھارت کی پہلی خاتون نباتات دان (Botanist) ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ 'پدمشری' حاصل کرنے والی ملک کی پہلی خاتون سائنسداں تھیں۔ 1920 سے پہلے بھارت میں گنے (Sugarcane) کی پیداوار اتنی اچھی نہیں تھی، لیکن جانکی امال کی منفرد تحقیق نے دیسی گنے کو مٹھاس سے بھر دیا۔ ڈاکٹر امال کی یہ تحقیق ہندوستانی زراعت (Agriculture) کی ترقی میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر امال کی گنے کی ہائبرڈ اقسام کی دریافت اور کراس بریڈنگ (Cross Breeding) پر تحقیق کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ بوٹینیکل سروے آف انڈیا (Botanical Survey of India) کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کرنے والی جانکی امال نے کئی پھولوں کے کروموسومز (Chromosome) پر بھی اہم تحقیقی مطالعے کیے۔ لندن کی رائل ہارٹیکلچرل سوسائٹی (Royal Horticultural Society) میں میگنولیا (Magnolias) پھول کے کروموسومز پر مطالعہ کرنے کے بعد ان کے نام سے ہی پھول کا نام 'میگنولیا کوبس جانکی امال' (Magnolia kobus 'Janaki Ammal') رکھا گیا۔ 7 فروری 1984 کو مدراس میں 86 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

کملا سوہنی (Kamala Sohonie): کملا سوہنی سائنس کے میدان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ انھیں ہر پودے کے خلیے میں ''سائٹوکروم-سی (Cytochrome C)'' نامی انزائم کی دریافت کے لیے ان کی اہم تحقیق کے طور پر جانا جاتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ ممتاز سائنسداں سی وی رمن (C.V. Raman) کی پہلی خاتون طالبہ رہنے والی کملا سوہنی نے نوبل انعام یافتہ فریڈرک ہاپکنز (Frederick G. Hopkins) کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔

کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ممبئی آ کر سائنسی ادارے (Royal Institute of Science) میں بایوکیمسٹری کے شعبے میں پروفیسر کے طور پر تحقیق کرنے لگیں۔ اس دوران انھوں نے "نیرا (Neera)" نامی مائع پر قابل ذکر کام کیا جو کھجور (Palm) کے درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے نیرا میں موجود وٹامنز اور آئرن کا استعمال حاملہ خواتین اور بچوں کی صحت کے تحفظ کے لیے کیا۔ دودھ کو جلدی دہی میں جمنے سے روکنے کے لیے ایک طریقہ کار وضع کرنے پر انھیں راشٹرپتی ایوارڈ (Rashtrapati Award) سے بھی نوازا گیا۔

بیبھا چودھری (Bibha Chaudhary): کلکتہ میں 1913 میں پیدا ہونے والی بیبھا چودھری کلکتہ یونیورسٹی طبیعیات میں ایم ایس سی کرنے والی پہلی خاتون تھیں۔ انھوں نے ہومی جہانگیر بھابھا اور وکرم سارابھائی کے ساتھ بھی کام کیا۔ انھوں نے دیویندر موہن بوس کے ساتھ مل کر بوسون ذرہ (Boson Particle) کی دریافت کی۔ The University of Manchester سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بیبھا چودھری ایک ماہر ذراتی طبیعیات (Particle physics) تھیں اور کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کی تحقیق کے لیے مشہور تھیں۔ وہ فوٹوگرافک نیوکلیر ایمولشن (photographic nuclear emulsions) کے ذریعے میثنز (mesons) کا پتہ لگانے والے سائنسدانوں میں شامل ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں International Astronomical Union نے 2019 میں ایک ستارے (HD 86081) کا نام ان کے نام پر (بیبھا) رکھا۔ ان کا انتقال 2 جون 1991 کو ہوا۔

اسیما چٹرجی (Asima Chatterjee): 23 ستمبر 1917 کو کلکتہ کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہونے والی اسیما چٹرجی کو ملک کی اعلیٰ درجے کی کیمیا داں (Chemist) مانا جاتا ہے۔ انھوں نے نامیاتی کیمیا (Organic Chemistry) اور نباتاتی ادویات (Phyto-medicine) کے میدان میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

اسیما چٹرجی نے 'ونکا الکالائیڈز (Vinca Alkaloids)' کا استعمال کر کے کینسر (Cancer) کی دوا بنائی۔ اپنی تحقیق کے ذریعے انھوں نے مرگی (Epilepsy) اور ملیریا (Malaria) جیسی بیماریوں کے لیے مؤثر علاج تیار کیے اور 400 سے زائد تحقیقاتی مقالے بھی لکھے۔ اسیما بھارت کی پہلی خاتون سائنسداں تھیں جنھیں Indian Science Congress Association میں جنرل پریزیڈنٹ (General President) کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ سائنس کے میدان میں تعاون کے لیے 1962 میں UGC نے انھیں سی وی رمن ایوارڈ، 1975 میں انھیں پدم بھوشن سے سرفراز کیا گیا اور 1982 سے 1990 تک وہ راجیہ سبھا کے لیے نامزد ہوئیں۔ بھارت کی یہ سائنسی شخصیت 22 نومبر 2006 کو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ ہندوستان میں مائیکروویو انجینئرنگ (Microwave Engineering) اور اینٹینا انجینئرنگ (Antennae Engineering) کے میدان میں کام کرنے والی پہلی خاتون سائنسداں تھیں۔ 22 نومبر 2006 کو مغربی بنگال کے کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔

انا مانی (Anna Mani): انا مانی کو ایک طبیعیات داں (Physicist) اور موسمیات داں (Meteorologist) کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش 23 اگست 1918 کو کیرالا کے تراونکور (Travancore) میں ہوئی تھی۔ حکومت کی اسکالرشپ پر وہ موسمیات میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئیں اور واپس لوٹ کر بھارتی محکمہ موسمیات (Indian Meteorological Department) میں کام کرنا شروع کیا۔ انھوں نے شمسی تابکاری (Solar Radiation)، اوزون پرت (Ozone Layer)، اور ہوا سے توانائی (Wind Energy) کے میدان میں نمایاں کام کیا۔

بھارت کی ''ویدر وومن (Weather Woman)'' کے نام سے مشہور انا مانی کے موسم کی پیش گوئیاں ہمیشہ درست ثابت ہوتی تھیں۔ انھوں نے 1930 میں ڈاکٹر سی وی رمن کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ محکمہ موسمیات میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر رہتے ہوئے انھوں نے موسمیاتی آلات کے میدان میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔

16 اگست 2001 کو کیرالا کے ترویندرم میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ٹیسی تھامس (Tessy Thomas): ٹیسی تھامس کو بھارت کی

میزائل ویمن (Missile Woman) 'کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ملک کو میزائل ٹیکنالوجی کے میدان میں خود انحصار بنانے میں ان کا نمایاں کردار ہے۔ وہ ملک کے میزائل پروجیکٹ کی کمان سنبھالنے والی پہلی ہندوستانی خاتون اور دفاعی تحقیق و ترقی تنظیم (DRDO) میں ایرو اسپیس سسٹمز (Aerospace System) کی سابق ڈائریکٹر جنرل رہی ہیں۔1988 میں وہ ڈی آر ڈی او (DRDO) میں شامل ہوئیں، جہاں انھیں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے زیرِ نگرانی کام کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بیلسٹک میزائل، اگنی (Ballistic Missile, Agni) کے میزائل گائیڈنس، ڈیزائن کے میدان میں کام کیا۔2001 میں انھیں لال بہادر شاستری نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

درشن رنگناتھن (Darshan Ranganathan): درشن رنگناتھن ہندوستان کی مشہور کیمیا دان (Organic Chemist) تھیں۔ انھوں نے اپنے کام کے دوران یوریا چکر (Urea Cycle) اور پروٹین فولڈنگ (Protein folding) پر کئی اہم تحقیقات کیں۔

آنندی بائی جوشی (Anandibai Gopalrao Joshi): بھارت کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے غیر ملکی سرزمین پر ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔ان کے مقالے کا عنوان 'Obstetrics among Aryan Hindus' تھا۔ بھارت واپس آنے کے بعد انھوں نے طب اور صحت کے میدان میں قابل ذکر کام کیا۔26 ر فروری 1887 کو صرف 22 سال کی عمر میں بیماری کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔

رمن پریمالا (Raman Parimala): رمن پریمالا کی پیدائش 21 ر نومبر 1948 کو تمل ناڈو میں ہوئی۔ انھوں نے مدراس یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کیا اور بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ کئی سالوں تک ممبئی کے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ (TIFR) میں پروفیسر رہیں۔ انھوں نے ریاضی کے میدان میں نمایاں کام کیا ہے۔1987 میں انھیں شانتی سوروپ بھٹناگر ایوارڈ اور 2003 میں انھیں شری نیواس رامانجن جنم صد سالہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پچھلے سالوں کی نسبت خواتین کی تعداد میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں واقع ہوئی یا اس کی رفتار بہت سست ہے۔ سائنس کے میدان میں خواتین کی کمی کا ایک اہم سبب روایتی صنفی نظریات ہیں۔ لوگوں کے درمیان یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ زیادہ محنت اور زیادہ علم والے کام مرد ہی بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔خواتین گھر کے کاموں کے لیے بنی ہیں، اس لیے انھیں گھر کے کام کرنے چاہئیں یا ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے جسے وہ گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ آسانی سے سنبھال سکیں۔خواتین کو کام پر رکھنے یا فیلوشپ اور گرانٹس وغیرہ دینے میں پدرشاہی نقطہ نظر کو ترجیح دی جاتی ہے۔خواتین کے رول ماڈلز کی کمی، حمل کے دوران اداروں کا عدم تعاون اور کام کی جگہ پر حفاظتی مسائل خواتین کو اس شعبے سے دور رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان شعبوں میں خواتین کی کم تعداد کے لیے نہ صرف سماجی معیار بلکہ غیر معیاری تعلیم بھی ذمہ دار ہے۔

یونیسکو کے مطابق، دنیا بھر میں تیس فیصد ریسرچر خواتین ہیں۔ تاہم، یہ فیصد مردوں کے مقابلے میں اس شعبے میں تفاوت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس فرق کو تسلیم کرتے ہوئے، خواتین اور لڑکیوں کے عالمی دن کو منایا جاتا ہے تاکہ سائنس میں خواتین کی شراکتوں کو تسلیم کیا جا سکے اور تحقیق میں صنفی فرق کو ختم کیا جا سکے۔

"بھارت سرکار نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے ملک میں Science, Technology, Engineering, and Mathematics (STEM) کے شعبوں میں خواتین کو کیریئر بنانے کی ترغیب دینے کے لیے Department of Science and Technology نے 2019 سے "وگیان جیوتی اسکیم" شروع کی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے متعدد اسکیمیں شروع کی گئی ہیں، جن کا مقصد صنفی مساوات کو فروغ دینا، خواتین کی شراکت کو بڑھانا اور ان کی پیشہ ورانہ ترقی کی حمایت کرنا ہے۔"

بھارت سرکار نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے ملک میں Science, Technology, Engineering, and Mathematics (STEM) کے شعبوں میں خواتین کو کیریئر بنانے کی ترغیب دینے کے لیے Department of Science and Technology نے 2019 سے "وگیان جیوتی اسکیم" شروع کی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے متعدد اسکیمیں شروع کی گئی ہیں، جن کا مقصد صنفی مساوات کو فروغ دینا، خواتین کی شراکت کو بڑھانا اور ان کی پیشہ ورانہ ترقی کی حمایت کرنا ہے۔ ذیل میں حکومت کے ذریعے خواتین کے لیے کیے جانے والے اقدامات پیش کیے جارہے ہیں:

1۔ ویمن ان سائنس اینڈ انجینئرنگ-کرن (WISE KIRAN): یہ پروگرام سائنس اور ٹیکنالوجی (S&T) کے شعبے میں خواتین کی شرکت کو مختلف صنفی معاونت والے اقدامات کے ذریعے یقینی بناتا ہے۔ اس میں خواتین کو تحقیق کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں اور ان کے کیریئر کی ترقی کے لیے معاونت فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ دوبارہ تحقیق کے شعبے میں داخل ہوسکیں۔

2۔ انڈو-یوایس فیلوشپ فار ویمن ان STEMM: یہ اسکیم خواتین سائنسداں وں اور ٹیکنالوجسٹوں کو امریکہ کے معزز اداروں میں فیلوشپ پر تحقیق کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس فیلوشپ سے بین الاقوامی سطح پر تجربہ حاصل ہوتا ہے اور بھارت اور امریکہ کے درمیان سائنسی تعاون کو مستحکم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

3۔ Gender Advancement for Transforming Institutions (GATI) کا مقصد اداروں کو زیادہ صنفی حساس بنانے اور شمولیت بڑھانے کے لیے تبدیل کرنا ہے۔ اس کا مقصد سائنس اور ٹیکنالوجی میں صنفی مساوات کو بہتر بنانا ہے تاکہ خواتین کے لیے یکساں مواقع فراہم کیے جاسکیں۔

4۔ POWER-SERB یعنی Promoting Opportunities for Women in Exploratory Research: یہ اسکیم تحقیقاتی سرگرمیوں میں خواتین کی کم شرکت کو دور کرنے کے لیے ہے۔ اس کا مقصد تحقیق کے نئے شعبوں کو فروغ دینا اور سائنس اور انجینئرنگ میں صنفی تفاوت کو کم کرنا ہے۔

5۔ نیشنل ایوارڈ فار وومن سائنسداں: SERB Women Excellence Award کو وزارتِ ارضیات نے 2018 سے شروع کیا ہے جو ہر سال چالیس سال سے کم عمر کی خاتون سائنسداں کو دیا جاتا ہے۔

6۔ Women in Engineering, Science, and Technology (WEST): یہ پروگرام ہندوستانی سائنس ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ فیسلٹیز میپ (STEM-I) کے تحت 2022 میں شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کا مقصد STEM کے پس منظر والی خواتین کو فائدہ پہنچانا ہے تاکہ وہ ٹیکنالوجی اور اختراعی ماحولیاتی نظام میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔

یہ اسکیمیں اس عزم کو ظاہر کرتی ہیں کہ بھارت سرکار ایک جامع اور متنوع سائنسی کمیونٹی کو فروغ دینا چاہتی ہے، تاکہ خواتین کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ترقی کے برابر مواقع ملیں۔

مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سائنس کے شعبے میں بھی خواتین نے محنت اور لگن سے اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔ ان کی اختراعات اور تجربات نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن تیز رفتار ترقی کی اس دنیا میں ان کی رفتار کا پہیہ ابھی سست ہے۔ اس لیے موجودہ صورت حال میں تیزی سے تبدیلی لانے کے لیے ہمارے سماج، تعلیمی اداروں، کمپنیوں اور حکومتوں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی سائنس کی دنیا میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑنے والی خواتین کی کامیابی کی کہانیاں عوام تک پہنچانی ہوں گی تاکہ محدود ذہنیت والے طبقے کی سوچ میں تبدیلی لائی جاسکے اور ملک کی بیٹیاں سائنس کے شعبے میں اپنی بھرپور شرکت کو یقینی بناسکیں۔

□□□

Dr. Mohd Akmal Khan
Assistant Professor (Urdu)
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University,
Hyderabad, Telangana
Contact: 9491971786
Email: akmalkhanamu@gmail.com

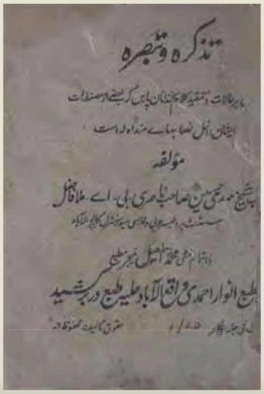

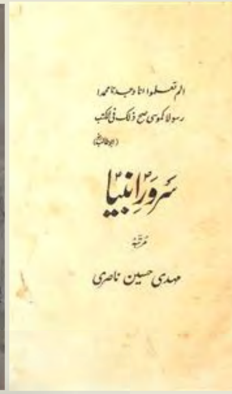

افزا خاتون

پروفیسر مہدی حسین ناصری

حیات اور ادبی خدمات

مہدی حسین ناصری کی پیدائش لکھنؤ کے محلّہ پاٹا نالہ کے ایک بہت ہی غریب گھرانے میں 1885 میں ہوئی تھی۔ ابھی وہ کچھ ہی سال کے تھے کہ ان کے والد شیخ عبداللہ کی وفات ہوگئی۔ والد کی وفات کے بعد والدہ نے قریب کی ایک مسجد میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا اور انھوں نے اپنی محنت سے صرف آٹھ سال کی عمر میں فارسی سیکھ لی۔ انھوں نے قرآن کا درس قاضی علی جان اور قاضی محمد مہدی سے لیا۔ ناصری کی شادی بارہ بنکی ضلع کے مولانا سید حلیم اسد کی صاحبزادی سعید النسا سے ہوئی تھی اور اللہ نے انھیں چار اولاد عطا کی، تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ چودھری سید علی اپنی کتاب میں ناصری کے متعلق کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

> ''پروفیسر مہدی حسین نام ناصری تخلص لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ کمسن ہی تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ماں نے محلے کے ایک مولوی کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ ذہن اور حافظہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی عطا ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شوق تحصیل علم بہت زیادہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چودہ سال کے سن میں ڈل انگلش کا امتحان، سولہ سال کے سن میں 1901 میں انٹرنس کا امتحان پاس کرلیا'' 1

قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1910 میں انٹرمیڈیٹ پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ 1911 میں فاضل 1912 میں بی۔ اے اور 1916 میں الٰہ آباد سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھیں تعلیم حاصل کرنے کا اور الگ الگ زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے انھوں نے عربی، فارسی، جرمن، اردو، عبرانی، انگریزی اور فرانسیسی میں تقریباً سات زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ مہدی حسین ناصری خود تو شاعر اور ادیب تھے ہی اس کے علاوہ ان کی پوتی مسرور جہاں بھی لکھنؤ

کی مشہور و معروف فکشن نگار تھیں۔ فاضل احسن ہاشمی کی کتاب میں وہ کچھ اس طرح لکھتی ہیں۔

''ناصری مرحوم کا امتیاز یہ تھا کہ وہ سات زبانیں جانتے تھے۔ ان کی تحریر کردہ کئی کتابیں فی زمانہ نایاب ہیں البتہ آپ کی کتاب فارسی ادب کی تاریخ 'صنادید عجم' ہندوستان کی تقریباً ساری یونیورسٹیوں کے نصاب میں آج تک شامل ہے۔ آپ کا دیوان 'نذر احباب' کے نام سے 1933 میں شائع ہوا تھا۔ 'نذر احباب' کا منتخب کلام 'غبار صحرا' کے نام سے برادر عزیز وقار ناصری نے چند سال قبل شائع کرایا تھا۔ ناصری مرحوم میرے جد امجد تھے اور یہ تعارف میرے لیے باعث فخر اور افتخار ہے۔'' 2

ناصری کی پہلی ملازمت کا آغاز 1907 میں آئی۔ ٹی کالج میں اس وقت ہوا ہے جب وہاں فارسی کے استاذ کی ضرورت تھی۔ اس وقت ناصری خود ایک طالب علم تھے لیکن انھیں اپنی آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ملازمت کرنا بھی ضروری تھا۔ 1914 میں الٰہ آباد کے کالج میں عربی فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1921 میں بجنور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ اس طرح ان کی تقرری مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتی رہی۔ بجنور سے بارہ بنکی آ گئے اور انھوں نے وہاں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں 1924 تا 1929 اس طرح تقریباً پانچ سال گزارے۔ بارہ بنکی سے وہ علی گڑھ آ گئے اور وہاں کے گورنمینٹ ہائی اسکول میں بطور ہیڈ ماسٹر خدمات انجام دیتے رہے۔

پروفیسر مہدی حسین ناصری کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب وہ 19 سال کے تھے۔ انھوں نے حضرت رشید کی شاگردی اختیار کی۔ قصائد، غزلیں، قطعات، اور رباعی غرض یہ کہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے دیوان کا نام 'نذر احباب' ہے۔ ان کی ترجمہ شدہ اور تصنیف کردہ کتابیں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی کتاب 'سرور انبیا'، 'کارلائل کی تقریروں'، 'دی ہیروایز پرافٹ' کا ترجمہ ہے۔ مہدی حسین ناصری 'سرور انبیا' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''الحمد للہ کہ جناب سرور انبیا احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ ﷺ کی ہدایت کاملہ کا اب یہ عالم ظاہر ہوا ہے کہ جن قوموں کو عرصہ دراز تک ظلمت تعصب نے نور اسلام سے بے بصیرت رکھا تھا وہ بھی حسن ظن شارح اسلام کی طرف پیدا کرتی جاتی ہیں بلکہ ان میں سے وہ لوگ جو شوق تحقیق اور اظہار میں ہوالحق کا ذوق سلیم لے کر دنیا میں آئے ہیں موافق اپنی استعداد و دریافت کے یہ شہادت بھی دیتے ہیں کہ جناب نبی عربی پیغمبر خدا تھے۔ ایسے لوگوں میں قابل ذکر نام طامس کارلائل کا ہے جنھوں نے 1850 میں چھ تقریریں جلیل القدر انسانوں کے متعلق لندن میں بیان کی ہیں'' 3

'زینت وحش وطیر' اس کتاب کے نام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں چرند پرند اور جانوروں کی حالت زندگی بیان کی گئی ہیں۔ 'سرگشت منصور' اصل تصنیف مولانا محمد فائق کی ہے جو کہ جرمن میں ہے۔ مہدی حسین ناصری نے ترجمہ کر کے اسے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں بونا پارٹ کے اچھے سلوک کو بہت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ 'صنادید عجم' ناصری کی سبھی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول و معروف کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ فارسی شعرا کی تاریخ کو یکجا کر دیا جائے تا کہ جو طالب علم فارسی شاعروں کے متعلق پڑھنا یا جاننا چاہتے ہوں وہ آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں 'صنادید عجم' کے عرض حال میں وہ لکھتے ہیں۔

''برسوں کی آرزو ہے کہ فارسی کی تاریخ ادب مذاق حال میں مرتب کی جائے اور فلسفہ لغت و فن تنقید کی مدد سے سخنوران ایران کی داد دی جائے۔ اسی شوق میں السنہ مختلفہ کی تاریخ ادب اور تنقید کلام کی ورق گردانی کی اور مدتوں نظم و نثر کے میدان میں طبیعت جولاں رکھا تا کہ بے سوادی دور اور کچھ سلیقہ آ جائے تو بقدر حوصلہ چند ورق تحریر کروں۔ غرض ہمت کمال کی طالب رہی اور کم فرصتی ہر طلب پر غالب رہی''

مہدی حسین ناصری نے نثر کے ساتھ شاعری میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ کلیات ناصری 1933 میں منظر عام پر

آیا۔کلیات ناصری میں اول اور دوم کر کے دو حصے دیے ہوئے ہیں۔ تقریباً دونوں حصوں کی غزلوں میں تاریخ اور سن درج ہے۔دیوان اول کی ایک غزل دیکھیے جس میں 17 مئی 1908 درج ہے۔

صبر امتحان عشق میں بالکل نہ ہو سکا
جب درد اٹھا تو دل سے تحمل نہ ہو سکا

سوز جگر کا ضبط تو بالکل نہ ہو سکا
وہ آگ لگ گئی کہ تحمل نہ ہو سکا
کیا دل نے دی خبر کہ چلے آئے لاش پر
کچھ دیر اور تم سے تغافل نہ ہو سکا

گل تو شگفتہ ہو گئے باد بہار سے
لیکن علاج حسرت بلبل نہ ہو سکا

ان قافیوں میں کہہ تو لیے شعر ناصری
لیکن ذرا بھی ہم سے تغزل نہ ہو سکا

مہدی حسین ناصری کے کلام کے متعلق امرناتھ جھا کہتے ہیں۔

''ناصری کا کلام حسرت و حرماں کا آئینہ ہے مگر اس میں جھوٹ موٹ کی ہائے وائے نہیں ہے بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے جو سننے والے کے تار رگ جان کو مضراب اضطراب سے چھیڑ دیتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو فلسفہ حزن کا ماہر ہے۔نفسیات کے راز و دلگداز نغموں میں دہرا رہا ہے۔کہیں کہیں خوشی کی ترنگ بھی ہے۔مگر اس کا منشا صرف اس قدر ہے کہ الم ناکی اور اجاگر ہو جائے جس طرح راگ کی دل آویزی سرگم سے بڑھ جاتی ہے''5

پروفیسر مہدی حسین ناصری صرف شاعر و ادیب ہی نہیں تھے بلکہ وہ استاذ الاساتذہ بھی تھے۔انھوں نے فراق گورکھپوری اور سید اعجاز حسین جیسے شاگرد بھی اردو ادب کو دیے۔

1931 مارچ کا مہینہ تھا۔علی گڑھ میں مقیم تھے کہ ان پر ایک طرف فالج گر گیا۔علاج چل ہی رہا تھا کہ دوسری طرف بھی فالج نے اٹیک کر دیا۔ان مسلسل حملوں کی وجہ سے ان کی ہمت نے جواب دے دیا اور مئی 1931 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ان کے جنازے کو علی گڑھ سے بارہ بنکی لایا گیا اور اس امام باڑے میں دفن کیا گیا جسے انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔مہدی حسین ناصری نے محض 46 سال کی عمر پائی۔اتنی کم عمر میں انھوں نے سات زبانیں سیکھی، ترجمے کیے، نذر احباب جیسا دیوان تیار کیا اور ایسے شاگرد تیار کیے جنھوں نے ادب کی دنیا میں عزت و شہرت حاصل کی۔لیکن اہل ادب نے ان کو فراموش کر دیا ان پر جتنا لکھا جانا چاہیے تھا اس طرح کچھ بھی نہیں تحریر کیا گیا۔مفصل طور پر ان پر لکھی گئی صرف دو کتابیں ہیں جو میری نظروں سے گزری ہیں۔سب سے پہلے جنھوں نے ان پر توجہ دی وہ فاضل احسن ہاشمی ہیں جنھوں نے شیخ مہدی حسین ناصری ایک فراموش صاحب کمال کتاب تحریر کر کے 2016 میں شائع کرایا۔دوسری وقار ناصری کی ہے جنھوں نے 'پروفیسر مہدی حسین ناصری: افکار و آثار' کے نام سے کتاب لکھ کر 2018 میں اسے شائع کرایا۔اہل ادب کو ان پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے کارناموں کو وہ لوگ بھی جان سکیں جو اب تک ان کی خدمات اور کارناموں سے ناواقف ہیں۔

حواشی

1 تاریخ بارہ بنکی، چودھری سید علی محمد زیدی، ص 264
2 شیخ مہدی حسین ناصری: ایک فراموش صاحب کمال، تحقیق و تدوین، ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی، ص 7، سال اشاعت 2016
3 سرور انبیا، مرتبہ مہدی حسین ناصری۔ص۔6
4 صنادید عجم، مرتبہ مہدی حسین ناصری، ص 1، سال اشاعت 1965
5 نذر احباب، کلیات ناصری، ص 3، اشاعت 1833

❑❑❑

Afza Khatoon
Hind Pharma, Below Alamnagar
Railaway Bridge, Alamnagar Road
Raja Ji Puram
Lucknow-226017 (U.P)

ام سلمہ

'رات کا دوسرا کنارا'
انسانی رویوں کا آئینہ دار

ڈراما ادب کی ایک اہم اور مختلف صنف ہے کیونکہ اس میں دوسری تخلیقات کے مقابلے میں کہانی کے کرداروں کو ایکشن اور مکالموں کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔ یونانی فلسفی ارسطو نے سب سے پہلے اپنی کتاب بوطیقا میں ڈرامے کی تعریف کی اور اسے انسانی اعمال کی نقل قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامے میں صرف الفاظ نہیں بلکہ کرداروں کے اعمال بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ناظرین یا قارئین کے جذبات اور سوچ پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ کسی بھی انسان کا رویہ اور اس کے مزاج میں تبدیلی اکثر مخصوص نفسیاتی یا سماجی حالات کے ردعمل میں ہوتی ہے، اور یہی تبدیلیاں ڈرامے کو موثر اور حقیقت سے قریب تر بناتی ہیں۔ ڈرامے کے ان لوازمات پر پورا اترنے اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ڈراما نگار اس فن سے واقفیت رکھتا ہو۔ اشرف عادل کی یہ کتاب 'رات کا دوسرا کنارہ' جو کہ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے، ان کی مہارت اور فنی صلاحیت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ ریڈیو پر ڈرامے نشر ہونے سے پہلے تھیٹر میں اداکار اپنی حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات کے ذریعے کردار کو پیش کرتے تھے اس لیے جب ڈراما ریڈیو پر نشر ہونے لگا، تو ایک نیا چیلنج سامنے آیا: اب سامعین کو کہانی صرف آواز کے ذریعہ سمجھنی تھی اور انھیں کرداروں، مقامات اور جذبات کی تصویریں اپنے ذہن میں خود تخلیق کرنی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیائی ڈراما نگاروں کا کام اور بھی مشکل ہو گیا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے اشرف عادل اس کتاب میں ''اپنی بات'' موضوع کے تحت فرماتے ہیں:

> ''ٹی وی اور اسٹیج ڈراموں کا تعلق دیکھنے سے ہے جب کہ ریڈیائی ڈرامے کا تعلق سماعت یعنی سننے سے ہے۔ ٹی وی اور اسٹیج ڈرامے کو جس طرح ایک پیش کار لوگوں تک پہنچاتا ہے وہ بالکل اسی انداز کے ساتھ ناظرین تک پہنچاتا ہے اس میں دیکھنے والوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا سوائے دیکھنے کے۔ جب کہ ریڈیائی ڈراما میں ایک سامع کا بھی اچھا خاصا رول ہوتا ہے۔ ڈراما سننے کے دوران ایک سامع منظروں کی تصویر کشی اپنے تخیل کے پردے پر خود کرتا ہے۔ ڈراما نگار کا اس میں ایک اہم رول ہوتا ہے اگر ڈراما نگار منظر نگاری کے فن سے بخوبی واقف ہے تو وہ اپنے سامعین کو بہترین مواد پیش کر سکتا ہے تا کہ ایک سامع اپنے ذہن کے پردے پر خوب سے خوب اس مواد کا استعمال کر سکے۔ کیونکہ یہاں ڈراما نگار کو ہر ایک منظر مکالموں کے ذریعے سامعین تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے''۔ (ص 17)

یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ڈراما نگاروں کو اسکرپٹ میں ایسے مکالمے لکھنے پڑے جو سننے والوں کے ذہن میں پوری کہانی کو واضح کر

سکیں۔اس کے علاوہ، آوازوں کے اتار چڑھاو، پس منظر کی آوازیں {sound effects}، اور موسیقی کا درست استعمال بے حد اہم ہو گیا تا کہ سامعین کو حقیقت کا احساس ہو۔اشرف عادل کے ڈراموں میں ان میں سے کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی، انھوں نے جگہ جگہ واضح کیا ہے کہ پس منظر میں کہاں کون سی آواز کا استعمال ہو گا یا کس قسم کی موسیقی چلائی جائے گی۔

''اشرف عادل کی کتاب 'رات کا دوسرا کنارہ' کا مطالعہ کرکے یہ بھی واضح ہو تا ہے کہ ان کی ادبی صلاحیت صرف شاعری تک محدود نہیں بلکہ وہ ڈراما نگاری میں بھی اپنی منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔ ان کے ڈرامے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک عہد کی ترجمانی کرتے ہیں، جہاں تاریخ کے نقوش، سماجی ناانصافیاں، طبقاتی کشمکش اور انسانی جذبات کی گہرائی یکجا ہو کر قاری یا سامع کے دل پر نقش چھوڑ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقیات کا درس بھی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مکالموں کی بے ساختگی، الفاظ کی روانی اور کرداروں کی حقیقت پسندی ایک ایسا ماحول تخلیق کرتی ہیں جہاں قاری کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ خود کو کہانی کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔''

اشرف عادل کی کتاب 'رات کا دوسرا کنارہ' کا مطالعہ کر کے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کی ادبی صلاحیت صرف شاعری تک محدود نہیں بلکہ وہ ڈراما نگاری میں بھی اپنی منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔ان کے ڈرامے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک عہد کی ترجمانی کرتے ہیں، جہاں تاریخ کے نقوش، سماجی ناانصافیاں، طبقاتی کشمکش اور انسانی جذبات کی گہرائی یکجا ہو کر قاری یا سامع کے دل پر نقش چھوڑ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقیات کا درس بھی دیتے ہیں۔ان کی تحریروں میں مکالموں کی بے ساختگی، الفاظ کی روانی اور کرداروں کی حقیقت پسندی ایک ایسا ماحول تخلیق کرتی ہیں جہاں قاری کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ خود کو کہانی کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

ان کا یہ مجموعہ آٹھ ڈراموں پر مشتمل ہے اور سب سے پہلا ڈراما 'ڈھلتے سائے' ہے۔اس ڈرامے میں انھوں نے بار ہا بیان کیا جانے والا مگر توجہ طلب موضوع چھیڑا ہے۔یہ ایسے لوگوں کے درد کی کہانی ہے جن کو اکثر خوشحال سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ اپنی نوکریوں سے سبکدوش شدہ لوگ ہیں جو ساری زندگی دوسروں کی خوشیوں کے لیے جیتے ہیں،عزت ورتبہ و پیسا کما کر گھر والوں کی زندگی کا مستقبل تو سنوار دیتے ہیں لیکن اپنا مستقبل ان کی نذر کر کے اپنے ہی گھر میں تنہا، لاوارث، غیر ضروری اور بے کار سامان کی طرح پڑے رہتے ہیں اور ان سے گھر کے چھوٹے موٹے کام لیے جاتے ہیں۔حالانکہ ان کے گھروں میں نوکر چاکر بھی ہوتے ہیں لیکن ان بوڑھے لوگوں کی ضروریات ان سے پوری نہیں ہوتیں۔اشرف عادل نے نہایت ہی موثر انداز میں دکھایا ہے کہ ان کمزور لوگوں کو نوکروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی ضرورت ہوتی ہے:

''پروفیسر کرمانی: لیکن تمہارے گھر میں اتنے نوکر ہیں؟
تمہارے ذاتی کام نوکر نہیں کر سکتے۔

شہناز: کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو نوکر نہیں کر سکتے۔

پروفیسر کرمانی: مثلاً

شہناز: محبت۔صحت کا خیال۔سونے کا وقت۔دوائی لینے کا وقت۔ان سب چیزوں کا خیال نوکر نہیں رکھ سکتے۔میں ایک دن میں ایک لاکھ روپیہ خرچ کر سکتا ہوں لیکن محبت اور اپنائیت کا ایک لمحہ خرید نہیں سکتا''۔

(ص 43)

ان کے ان ڈراموں میں سماج کے بہت سے روپ دکھائی دیتے ہیں۔وہ ایک ڈرامے میں ایک ہی موضوع کو نہیں بلکہ آنکھیں کھول دینے والے کئی مطالب بیان کرتے ہیں۔اب اسی ڈراما 'ڈھلتے سائے' کو ہی دیکھ لیجیے اس میں نہ صرف سبکدوش لوگوں کے درد و کرب کو دکھایا گیا ہے بلکہ اس سماج کا دوغلا پن بھی دکھایا ہے۔جیسے کہ پروفیسر کرمانی کہتے ہیں کہ جب وہ نوکری میں تھے تو ان کی باتوں میں کتنا اثر تھا، لوگ اور گھر والے ان کی کتنی عزت کیا کرتے تھے لیکن اب جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں ان کا وہ مقام نہیں رہا۔

معلوم ہوا کہ ہمارا یہ سماج کتنا بے قدر ہے اور سب سے بڑی بات لوگ صرف آدمیوں کے رتبوں کی قدر کرتے ہیں انسان بذات خود ان کی نظر میں قابل احترام نہیں۔

اس مجموعے کا دوسرا ڈراما '27 گھنٹے' کا ہے۔ اس میں اشرف عادل صاحب نے خود کو انسان کہنے والوں کو آئینہ دکھایا ہے کہ جانور جو فطرتاً ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ بھی مصیبت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار ہوتے ہیں لیکن انسان کو تو انسانیت کے لیے پیدا کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی حیثیت بھول کر جانوروں کی طرح ایک دوسرے کا شکار کرنے میں لگا ہوا ہے۔ انسان اتنا گر چکا ہے کہ اگر ایک کا گھر جل رہا ہو تو دوسرا اس آگ کی تپش میں اپنی روٹیاں سینکنے آجائے گا۔ جس طرح اس ڈرامے میں میڈیا کوریج لینے والے کے لیے کوئی حادثہ حادثہ نہیں بلکہ ٹی وی پہ دکھانے کے لیے ایک نئی اسٹوری ہوتی ہے جس کو پا کر وہ خوش تو ہوتے ہی ہیں اوپر سے ٹی وی پر انسانیت کا راگ بھی آلاپتے ہیں۔

اشرف عادل کا یہ مجموعہ صرف روایتی یا سیاسی موضوعات تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے جدید دور کے مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ اس کا ثبوت ان کا تیسرا ڈراما 'ایک شب طلسمات کی' ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے بے دریغ استعمال، اس کے اخلاقی، سماجی اور نفسیاتی نقصانات جیسے موضوعات اس ڈرامے میں نمایاں ہیں۔ ان کے ڈرامے محض تفریح و تفنّن کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں۔ ڈراما "فن کار" ہمارے سماج کا وہ کالا سچ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے برے اعمال کا قصوروار کسی کو ٹھہرا دو اور دوسروں کے اچھے کاموں کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈال دو۔ یہ سب آئے دن ہم اپنے اطراف میں ہوتے دیکھتے ہی ہیں۔ اس ڈرامے کے کردار بصیر سے انجم نامی آرٹسٹ اس کی پینٹنگ منہ مانگے داموں میں خریدنا چاہتی ہے تاکہ اس کی جگہ وہ اس تصویر پر ایوارڈ حاصل کر سکے لیکن منع کرنے پر بصیر کو اپنا ایک بازو کھونا پڑتا ہے حالانکہ انکار کرنا اس کا حق تھا۔ یہ ڈراما فنکاری، حسد، شہرت کی ہوس اور تخلیقی آزادی جیسے موضوعات کو اجاگر کرتا ہے۔

ڈراما "نفرت کی لکیر" دو ملکوں کے درمیان کھینچی گئی سرحدی لکیر کے پس منظر میں دو سچے دوستوں کی کہانی ہے جو دشمن ملکوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے درد اور تکالیف میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ دونوں دوست سرحدی کشیدگی اور سیاسی دشمنیوں کے باوجود اپنی دوستی کو قائم رکھتے ہیں، مگر ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر ان کا میل جول کسی کی نظروں میں آ گیا تو انھیں غدار قرار دے دیا جائے گا۔

> "شانتی: امن۔ اب ہمیں اپنی اپنی بارکوں کی طرف لوٹنا چاہیے۔ وقت بھاگ رہا ہے۔ دیکھو! چودھویں کا چاند آسمان کے بیچ میں پہنچ چکا ہے اور ہم دونوں یہاں اس سنسان سرحد پر سکھ دکھ بانٹ رہے ہیں لیکن ہمیں یہ احساس نہیں ہے کہ یہ سرحد کوئی معمولی لکیر نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ناگن ہے جو کبھی بھی ہم دونوں کو ڈس سکتی ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے دودھ پلا رہے ہیں۔ چلو پھر اجازت لیتے ہیں ایک دوسرے سے"۔ (ص 166)

یہ ڈراما نفرت اور محبت کے درمیان کشمکش، سیاست کے نام پر بنی دیواروں اور انسانی رشتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ کہانی دکھاتی ہے کہ سرحدیں ملکوں کو تو الگ کر دیتی ہیں مگر دلوں کے درمیان کھینچی گئی لکیر کو محبت اور خلوص مٹا دیتا ہے۔ ڈراما "ایک انوکھا قرض" انسانی جذبات، فرض شناسی اور ہمدردی کے موضوعات کو اجاگر کرتا ہے۔ اس میں امید اور والدین کی محبت کو دکھایا گیا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ امید انسان کو جینے کا ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ جیسے راحت علی بوڑھا اور ضعیف ہونے کے باوجود اپنی زندگی کو بیٹے کے آنے کی امید میں تنہا کاٹ رہا ہوتا ہے۔ راحت علی کے بیٹے مختار احمد کی جگہ مختار چند کا ہسپتال پہنچنا اور اس کا ایک بوڑھے، بے سہارا کی خدمت کے موقعے کو ضائع نہ ہونے دینا ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ خدمت اور انسانیت کے جذبے کے لیے کسی خاص رشتے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ نیک نیتی اور خلوص ہونا چاہیے۔ بوڑھے کا ہسپتال میں اتنے لمبے انتظار کے بعد میں اپنے بیٹے کی جگہ مختار سے ملنا اور اپنے بیٹے کے چار مہینے پہلے مارے جانے کا سچ جاننے سے پہلے انتقال کر جانا دکھاتا ہے کہ کبھی کبھار سچائی وقت پر نہ جاننا بھی ایک نعمت ہو سکتی ہے۔

ڈراما 'رات کا دوسرا کنارا' رشتوں کی پیچیدگی، غلط فہمیوں کے تباہ کن اثرات اور سچائی و محبت کی قدر کو گہرے جذباتی انداز میں پیش کرتا ہے، جو اسے نہایت اہم اور فکر انگیز بناتا ہے۔ یہ ڈراما ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیشہ حقیقت وہی نہیں ہوتی جو ہمیں نظر آتی ہے۔ مراق ساری زندگی ماں سے خفا رہا لیکن جب اس کو حقیقت کا علم ہوا تب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جس طرح ڈراما 'ایک انوکھا قرض' میں بتایا گیا کہ کبھی سچائی کا دیر سے پتا چلنا ایک نعمت ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح اس ڈرامے میں اس کا الٹا ہے کہ کبھی کبھی سچائی کا دیر سے آشکار ہونا سب سے بڑا پچھتاوا بن سکتا ہے۔ اس لیے رشتوں میں غلط فہمیوں کو وقت پر دور کر لینا ضروری ہے۔ اس مجموعے کا آخری ڈراما 'سوالیہ نشان' میں اشرف عادل نے سماجی بیداری کا کام کیا ہے۔ یہ ڈراما انسان اور اس کی خود غرضی اور ماحولیاتی تباہی کے نتائج پر ایک سوالیہ نشان ہے یا یوں کہیے انسان کی بے حسی اور غیر ذمے داری پر احتجاج ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر ہم قدرت کے اصولوں کو نظر انداز کرتے رہیں تو تباہی ناگزیر ہے۔ انور جیسے دیانت دار افراد کو کرپٹ نظام کام نہیں کرنے دیتا، جو ظاہر کرتا ہے کہ سچائی دبائی جا سکتی ہے مگر اس کے اثرات کو روکا نہیں جا سکتا۔

"سارہ: مجھے یاد ہے آپ کتنے فرض شناس ہوا کرتے تھے۔ آپ کی ایمانداری کی وجہ سے ہم نے بہت غم اٹھائے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری سے تیسری جگہ آپ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اسی جدوجہد میں ساری زندگی گزر گئی۔ پھر سال پہلے آپ ریٹائر ہوئے اور ہمیں آرام ملا۔" (ص 257)

یہ ڈراما محض ایک کہانی نہیں، بلکہ ہمارے دور کے سب سے بڑے مسائل جیسے ماحولیاتی تباہی، کرپشن اور انسان کی لاپرواہی پر سخت تنقید ہے۔ اشرف عادل ان ڈراموں کے ذریعے سامعین کو سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی کہانیاں جان دار اور پرکشش ہوتی ہیں۔ بہترین مکالمے اس ڈرامائی مجموعہ کا اثاثہ ہیں۔ درج ذیل چند جملے ملاحظہ ہوں جو ان ڈراموں کی گہرائی اور اثر انگیزی کو مزید اجاگر کرتے ہیں:

''ہرن: ہاں خرگوش بیٹا۔ انسان ہمیں انسانیت سکھا کر خود درندہ بن بیٹھا''۔ (ص 70)

''شانتی: وجاہت بھائی۔ گھر سے دور تو ہیں لیکن گھر کی الجھنیں سینے کے اندر سکون دل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں''۔ (ص 168)

''امن: تصور۔ مجھے شانتی پر بھروسہ ہے وہ میرے بھروسے کی پتنگ کا دھاگا کبھی کاٹ نہیں سکتا'' (ص 175)

''سحرش: آپ نے بولنے کا موقع ہی کب دیا؟ آپ تو فقط اب کڑوا بولتے ہیں بہترین انسان اپنی میٹھی زبان سے ہی پہچانے جاتے ہیں ورنہ اچھی باتیں دیواروں پر بھی لکھی ہوتی ہیں'' (ص 232)

''آپ کبھی تو اپنے خیالوں کا سنگار کریں اور پھر میری آنکھوں کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھیں''۔ (ص 259)

اشرف عادل کا قلم ایسا جادوئی ہے جو قارئین کو کہانی کے شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ ان کی فلسفیانہ بصیرت کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی اور روانی کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ ہر لفظ ایک معنی کا خزانہ محسوس ہوتا ہے۔ ان کے ڈراموں کی کہانیاں روزمرہ کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو عیاں کرتی ہیں، مثلاً جذباتی غلط فہمیاں، ناانصافی، کرپشن، فطرت سے لاپرواہی اور نیکی کی بے لوث طاقت۔ یہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ اگر ہم حقیقت کو سمجھنے، رشتوں کی قدر کرنے اور اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے میں تاخیر کریں، تو زندگی ہمیں پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں دیتی۔

□□□

Umi Salma
Girls Hostal H,K
Room No : S39
Department of Persian
University of Kashmir
Hazratbal, Srinagar-190006 (J& K)
umi.prscholar@kashmiruniversity.net

کے۔ نادرہ بیگم

اردو کے تحفظ میں
وانیمباڑی کے تعلیمی اداروں کا کردار

شہر وانیمباڑی ریاست ٹمل ناڈو کے ترپاتور ضلع کا ایک مشہور علمی، ادبی اور تجارتی مرکز ہے۔ اس شہر کو عام طور پر جنوب کا علی گڑھ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک ایسے وقت، جبکہ ہندوستان میں تعلیمی اداروں کا فقدان تھا وانیمباڑی میں کئی تعلیمی ادارے شروع ہو چکے تھے اور تعلیم کی اہمیت یہاں کے عوام کے دلوں میں روشن ہو چکی تھی۔ نہ صرف مرد حضرات بلکہ خواتین میں بھی یہاں علم وادب کا ذوق بڑے زور وشور سے پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ وانیمباڑی کو اگر شہرِ سخن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جس طرح یہاں ادبا اور شعرا نے ادبی فضا کو باقی رکھا ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ یہ آج کل کی بات نہیں بلکہ دو سو سال پہلے ہی سے سخنوروں کی محفلیں یہاں سجتی تھیں بلکہ سرسید کی تحریک سے قبل ہی یہاں کی عوام میں علم وادب کا ذوق بڑا گہرا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ شہرِ وانیمباڑی کی علمی وادبی خدمات کا سلسلہ نوابوں کے دور سے چلا آرہا ہے اور شعر وادب کی خدمات میں نہ صرف مرد حضرات بلکہ خواتین بھی پیش پیش رہی ہیں۔ شہرِ وانیمباڑی کے تعلیمی اداروں اور ادبی انجمنوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہاں کے لوگوں کے ذوق سلیم اور تہذیبی شائستگی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں جب شمالی ہندوستان میں سرسید احمد کی تحریک بڑے زور وشور سے چل رہی تھی اس وقت وانیمباڑی کے مسلمانوں میں اس تحریک نے ایک ولولہ اور جوش پیدا کر دیا۔ یہ لوگ پورے جوش وجذبے کے ساتھ اٹھے اور مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور جگہ جگہ تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے گویا مشعل بردار کا کام کیا۔ 1901 میں وانیمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور ہمارے اسلاف نے بلا تفریقِ مذہب وملت سبھی کو سیکولر تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ اسی لیے وانیمباڑی کو جنوب کا علی گڑھ بھی کہا جاتا ہے۔ VME Society کے زیرِ نگرانی کئی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ VME Society نے سب سے پہلے 1903 میں اسلامیہ اسکول قائم کیا جو آج ترقی کے مختلف مدراج پار کرتے ہوئے اسلامیہ بائیس ہائیر سیکنڈری اسکول کی شکل میں خوب برگ وبار لا رہا ہے۔ 1916 VME Society نے اسلامیہ کالج وانیمباڑی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی شروعات 1919 میں ہوئی۔ مختلف ڈگری کورسس کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ کورسس یہاں پر شروع کیے گئے۔ آج یہ ایک منظور شدہ ریسرچ سنٹر بن چکا ہے۔

یہاں پر ملکی اور ریاستی سطح پر اردو کے کئی سیمینار، کانفرنسیں اور مشاعرے ہر سال کامیابی کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوتے چلے

آرہے ہیں۔ یہاں کی ریاستی زبان تمل ہونے کے باوجود بھی ہر سال سات سو سے زیادہ طلبا فرسٹ لینگویج اردو کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ کثیر تعداد میں کالج کے منتظمین اور اساتذہ مختلف اردو کے پروگراموں، سیمیناروں اور مشاعروں کے انعقاد سے ادب پروری اور ادب دوستی کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں نوجوان ادیب اور فنکاروں کو ابھر کر سامنے آنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنی کارکردگی سے اردو ادب کی محفلوں میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال اردو کا پچیسواں قومی میلہ ہے، جو 2022 میں NCPUL اور VME Society کے باہمی تعاون سے پوری کامیابی اور شان وشوکت کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ اردو کا یہ یادگار قومی میلہ کل نو (9) دنوں تک چلا۔ اس میں ملک بھر سے اردو کے شعرا، ادیب، صحافت نگار اور قلمکار اسلامیہ کالج ، وانیمباڑی میں تشریف لاتے رہے اور اپنی آمدورفت سے اس میلہ کو یادگار اور کامیاب بنا دیا۔ اس میلے میں ملک بھر کے مختلف کتب فروشوں نے بڑی نادر اور نایاب اردو کی کتابیں فروخت کیں۔ بہت سارے ادب دوست خواتین و حضرات کو اپنی پسندیدہ کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا بڑا زریں موقع حاصل ہوا۔ بلا شبہ اس میلے کا انعقاد کر کے VME Society کے منتظمین اور ذمے داران نے اپنی اردو دوستی کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔ وانیمباڑی کی تاریخ میں اردو کے اس میلے کا ذکر سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ اس میلے کے دوران ہر دن اردو کا کوئی نہ کوئی پروگرام منعقد کیا جاتا رہا اور ہر شام اردو ادب کی کوئی نہ کوئی محفل سجائی جاتی تھی جس میں ملک بھر سے ادب کے شائقین شرکت کرتے اور لطف اٹھاتے رہتے تھے۔

غرض اردو زبان وادب کے تحفظ میں وانیمباڑی کے اداروں کے منتظمین معلمین ، معلمات ،طلبا اور طالبات کا بڑا شاندار رول برسوں سے چلا آرہا ہے۔ اسلامیہ کالج وانیمباڑی کا ذکر کریں تو تقریباً نصف صدی کے زیادہ عرصے سے اردو زبان وادب کے فروغ کی بڑی شاندار روایت چلی آرہی ہے جن میں عہدِ ماضی کے نامور اساتذہ مرحوم جلال کڑپوی، جلال عرفان، ڈاکٹر مظفر شہ میری اور ڈاکٹر قاضی حبیب احمد کی انتھک کاوش اور کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، جن سے ہزاروں طلبا میں اردو ادب کا ذوق وشوق پیدا ہوا اور خوب پروان چڑھا۔ موجودہ زمانے میں تقریباً پچیس سال کے ایک طویل عرصے سے اردو کے نامور شخصیت اور معلم ڈاکٹر سعید الدین اپنی ایک طویل اور لامحدود خدمات سے اردو زبان وادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ جناب سعید الدین اردو کے قومی سیمیناروں، کانفرنسوں اور اردو ادب کی محفلوں میں شرکت فرما کر اپنے زریں خیالات سے اپنے طلبا اور اردو داں طبقے کو محظوظ فرما رہے ہیں۔ آپ نے اپنے ادبی سفر کے دوران ملکی اور ریاستی سطح پر اردو کے کئی ورک شاپس، سیمینار اور کانفرنس میں شرکت فرما کر اپنی اردو دوستی کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔ بلکہ خود بھی اپنی نگرانی میں کئی سیمینار اور اردو ادب کی محفلوں کا انعقاد کیا ہے۔

”اسلامیہ کالج کے ان باذوق معلمین اور محبان اردو کی کاوشوں اور کارناموں کو کم نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسلامیہ کالج کو آج اگر جنوب کا علی گڑھ کہا جاتا ھے تو ان حضرات کی لامحدود کاوشوں اور کارناموں کا صدر باب ان حضرات کو قرار دیا جاسکتا ھے۔یہی ھیں وہ باکمال شخصیات ھیں جنھوں نے موجودہ نسل کو اردو ادب سے جوڑے رکھا ھے۔آگے بڑھتے ھوئے اسلامیہ ویمنس کالج وانیمباڑی کی اردو خدمات کا تذکرہ بھی کرنا چاھیے۔ اس عظیم شھر کی تاریخ میں یہ بات سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ھے۔ VME Society نے 1997 میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت اور ترقی کو مد نظر رکھتے ھوئے وانیمباڑی میں ایک نسواں کالج کی بنیاد رکھی جس سے مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا دیرینہ خواب سچا ثابت ھوا۔کالج کی نصابی تعلیم میں اردو زبان کی تعلیم بھی لازم ھے“

اس سلسلے میں جناب پروفیسر تنویر احمد صدر شعبۂ اردو، عربی اسلامیہ کالج (خودمختار) وانیمباڑی شانہ بہ شانہ اردو ادب کی محفلوں،

مشاعروں اور سیمناروں میں جناب ڈاکٹر سعید الدین کو اپنی گراں قدر خدمات پیش کرتے آرہے ہیں۔ اسلامیہ کالج کے ان باذوق معلمین اور محبانِ اردو کی کاوشوں اور کارناموں کو کم نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسلامیہ کالج کو آج اگر جنوب کا علی گڑھ کہا جاتا ہے تو ان حضرات کی لامحدود کاوشوں اور کارناموں کا صدر باب ان حضرات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی ہیں وہ باکمال شخصیات ہیں جنھوں نے موجودہ نسل کو اردو ادب سے جوڑے رکھا ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے اسلامیہ ویمنس کالج وانیمباڑی کی اردو خدمات کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے۔ اس عظیم شہر کی تاریخ میں یہ بات سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ VME Society نے 1997 میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے وانیمباڑی میں ایک نسواں کالج کی بنیاد رکھی جس سے مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا دیرینہ خواب سچا ثابت ہوا۔ کالج کی نصابی تعلیم میں اردو زبان کی تعلیم بھی لازم ہے۔ اردو زبان جو اپنے اندر ہزاروں خوبیاں سمائے ہوئے ہے اس سے لڑکیوں میں بلند آدرش، اعلیٰ صفات، حسنِ اخلاق اور ادب پروری کا جذبہ بیدار کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے یہاں پر اعلیٰ معیاری اساتذہ کا تقرر کیا گیا ہے۔ یہ اساتذہ خود بھی اردو زبان وادب سے گہرا شغف رکھتی ہیں اور اپنی تربیت سے طالبات میں بھی اس دلچسپی کو ابھار رہی ہیں۔ کالج کے قیام کے ساتھ ہی یہاں پر شعبۂ اردو بھی قائم ہوا، ان معلمات میں محترمہ نادرہ بیگم تقریباً انیس سال کے طویل عرصے سے اردو کے اس چمن کی آبیاری کررہی ہیں تو محترمہ انیسہ صاحبہ تقریباً تیرہ سال سے بحیثیت معلّمہ اردو ادب کی بیش بہا خدمات دیتی چلی آرہی ہیں۔ تیسری معلّمہ محترمہ فوزیہ حبیب تقریباً آٹھ سال سے اپنی وسیع و عریض ادبی معلومات سے مستفیض کررہی تھیں۔ حال ہی میں ان کا تبادلہ قریب کے کالج میں ہوا۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان معلمات کے علاوہ محترمہ کریم النساء تقریباً سات سال سے اپنی انتھک محنتوں اور کوششوں سے یہاں کی طالبات میں اردو ادب سے دلچسپی بڑھا رہی ہیں۔ محترمہ رضوانہ تحسین جن کا تقرر ابھی حال میں ہوا ہے، وہ بھی اس کالج کی شعبۂ اردو کی معلّمہ ہیں وہ اپنی بسیط معلومات سے طالبات کو مستفیض کررہی ہیں۔ اردو کے ان معلمات کی کوششوں سے یہاں پر ہر سال تقریباً سات سو سے زیادہ طالبات اردو ادب سے فیض حاصل کررہی ہیں۔ غرض یہاں پر محبانِ اردو کا ایک جمِ غفیر ہے جو ہر سال اردو کی مختلف محفلیں منعقد کرتے ہیں، کبھی یوم سرسید کے طور پر تو کبھی یوم تعلیم کے نام پر، کبھی جشنِ علامہ اقبال تو کبھی یومِ غالب۔

اس سلسلے میں منتظمینِ کالج اردو کے طالبات اور اساتذہ کی ہر ممکن مدد کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں اپنا بھر پور تعاون عطا کرتے ہیں۔ شعبۂ اردو میں ایک لائبریری قائم ہے، جس میں اردو کے مختلف ناول، شعرا اور نثر نگاروں کی کتابیں، مختلف رسالے اور میگزین موجود ہیں۔ نہ صرف شعبۂ اردو کی لائبریری بلکہ ویمنس کالج کی سینٹرل لائبریری میں بھی اردو شعر وادب کی کتابوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، جن میں اردو تحقیق، تنقید، ناولوں کے علاوہ دورِ جدید اور دورِ قدیم کی مشہور تصانیف موجود ہیں، یہ تصانیف سفرنامے، سوانح حیات وغیرہ پر بھی مشتمل ہیں، یہاں پر نہ صرف اردو زبان وادب بلکہ مذہبِ اسلام کی کتابیں بھی اردو زبان میں موجود ہیں جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ یہاں کالج کے ذمے داران، معلمات اور طالبات کی کارکردگیوں کے دوررس نتائج واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

غرض یہ کاروانِ اردو آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ یہاں پر اردو زبان کی طالبات میں اپنی زبان وادب کے تئیں غیر معمولی دلچسپی پائی جاتی ہے، کیونکہ جنوبی علاقے کے کسی بھی کالج میں اردو کا کوئی بین الکلیاتی مقابلہ تقریر یا تحریر منعقد ہوتا ہے تو یہ لڑکیاں ادبی محفلوں کے مقابلوں میں شرکت کرکے اپنی قابلیت کا لوہا منواتی ہیں اور نمایاں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ ان طالبات کی اعلیٰ کارکردگی میں یہاں کی

معلمات کی تربیت اور کوششوں کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ شعبۂ اردو کی معلمات ہر سال بزم اردو، سیمینار اور کانفرس وغیرہ منعقد کر کے طالبات کی معلامات کو جلا بخشتی ہیں اور کالج کی سالانہ میگزین میں اپنے مضمون شائع کر کے اپنی اردو دوستی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ یہاں پر شعبۂ اردو کی معلمات ہر سال ISBN نمبر کے ساتھ پر مغز مقالہ پیش کر کے داد و تحسین حاصل کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں منتظمین کالج اردو کے طالبات اور اساتذہ کی ہر ممکن مدد کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انھیں اپنا بھرپور تعاون عطا کرتے ہیں۔ شعبۂ اردو میں ایک لائبریری قائم ہے، جس میں اردو کے مختلف ناول، شعرا اور نثر نگاروں کی کتابیں، مختلف رسالے اور میگزین موجود ہیں۔ نہ صرف شعبۂ اردو کی لائبریری بلکہ ویمنس کالج کی سینٹرل لائبریری میں بھی اردو شعر و ادب کی کتابوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، جن میں اردو تحقیق، تنقید، ناولوں کے علاوہ دورِ جدید اور دورِ قدیم کی مشہور تصانیف موجود ہیں، یہ تصانیف سفرنامے، سوانح حیات وغیرہ پر بھی مشتمل ہیں، یہاں پر نہ صرف اردو زبان و ادب بلکہ مذہب اسلام کی کتابیں بھی اردو زبان میں موجود ہیں جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ یہاں کالج کے ذمے داران، معلمات اور طالبات کی کارکردگیوں کے دوررس نتائج واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

غرض جب بھی شہر وانیمباڑی کے اردو ادب کی تاریخ مرتب ہوگی شعبۂ اردو اسلامیہ ویمنس کالج وانیمباڑی کی اردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ یہ ادارہ علم و ادب کا ایک گہوارا ہے جب تک یہ موجود ہے اردو زبان و ادب کو زوال نہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے لیے ہمیشہ یہاں پر راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

VME Society نے 26 اگست 1903 میں اسلامیہ اسکول وانیمباڑی شروع کیا جو چند سالوں میں 1912 میں ایک بھرپور ہائی اسکول میں تبدیل ہو گیا آج اس اسکول میں تقریباً 3000 طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ 1976 میں یہ اسکول ترقی پا کر اسلامیہ بائس ہائر سکینڈری اسکول میں بدل گیا۔ تقریباً 2000 سے زیادہ طلبا اردو زبان فرسٹ لینگویج کے طور پر سیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

ان کی تدریس کے لیے ماہر اور قابل اساتذہ مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ طلبا میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے لیے بڑی محنت کوششوں سے خدمات انجام دے رہے ہیں، جس کے نتیجے میں ہر سال یہاں کے طلبا ریاستی اور ضلعی سطح پر منعقد ہونے والے اردو کے مختلف ادبی مقابلوں میں شامل ہو کر انعام و اکرام کے حقدار ثابت ہوتے ہیں۔ اگر دور حاضر کے معلمین کا ذکر کریں تو تقریباً تین دہائیوں کے ایک طویل عرصے سے جناب مولوی رضوان الحق عمری اپنی علمی اور ادبی بصیرتوں سے طلبا کو مستفیض کرتے چلے آ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو زبان کے دیگر قابل معلمین بھی مقرر ہیں جو اپنے تدریسی فرائض بخوبی نبھا رہے ہیں۔ اپنی تدریسی اور تعلیمی خدمات سے اپنے طلبا میں تقریری اور تحریری صلاحیتیں کو فروغ دے رہے ہیں جو ملکی اور ریاستی سطح پر اردو کی مختلف محفلوں میں شامل ہو کر اپنی قابلیتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔

ان سب اداروں کے علاوہ وانیمباڑی کے کئی مدارس بھی ہیں جیسے انجمن خیرخواہ، مدرسۂ نسواں وانیمباڑی، مدرسۂ معدن العلوم، انجمن خدام الاسلام وانیمباڑی، مدرسہ احیاء العلوم وغیرہ جو اردو و ادب کے محافظ بن کر اردو و ادب کو زندہ اور پائندہ رکھے ہیں۔ شہرِ وانیمباڑی میں تیزی سے اردو ادب کے فروغ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ شہر ہر دور میں علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیتوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ایک طرف یہاں پر دینی تعلیم کی قدر ہے تو دوسری طرف دنیاوی تعلیم کا چرچا بھی۔ یہ لوگ شروع ہی سے علم و ہنر کے شیدائی اور میدانِ شعر و ادب کے شہسوار بھی ہیں، اسے گلستانِ ادب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس شہر نے علمی اور ادبی حیثیت سے اپنی جو پہچان بنائی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ داستان بلاشبہ آنے والی نسلوں کے لیے یقیناً ایک مثال اور مشعل راہ ثابت ہوگی۔

❑❑❑

Ms. K.Nadira Begum
HOD & Assistant Professor
Department of Urdu
Islamiah Women's Arts and Science College
Vaniyambadi- 635751(Tamilnadu)

سیدہ تبسم ناڈکر

غزلیں

○

ہے اکیلا مکیں مکاں، تنہا
جھیلتے ہیں عذابِ جاں، تنہا

یاد ہیں اب بھی وہ مقام مجھے
ہم ملے تھے جہاں جہاں، تنہا

بات دل کی بھلا کہیں کس سے
کوئی ملتا نہیں یہاں، تنہا

ایک طرف ان کی تقریریں
ایک طرف ہوں میں بے زباں، تنہا

تجھ سے ہو کر جدا مرے دل پر
یار چھائیں اداسیاں، تنہا

یہ تبسم کا حوصلہ دیکھو
دیتی آئی ہے امتحاں تنہا

○

حال دل کا تم نے میرے یار کیا سمجھا کبھی
درد و غم پر تم کو میرے آیا رونا کیا کبھی

ایک موسم دے گیا جذبات کو تسکیں مرے
ایک موسم لے گیا ہے جانبِ صحرا کبھی

ظلم تیرے سہہ کے بھی میں نے تو چاہا ہے تجھے
تو نے لیکن رحم کے قابل نہیں سمجھا کبھی

ہو رہا ہے ساتھ تیرے ذکر میرا اے صنم
تیری الفت کر نہ دے ہر سو مجھے رسوا کبھی

چار سو وہم و گماں کے آج کل تو سانپ ہیں
ڈر رہی ہوں ڈس نہ لے مجھ کو مرا سایہ کبھی

سائبانِ قرب میں اب دے دو مجھ کو تم جگہ
راکھ کر دے گا مجھے یوں دھوپ کا صحرا کبھی

درمیاں اپنوں کے ہوتا ہے تو جب دلبر مرے
کیا خیال اس دم ترے دل میں مرا آیا کبھی

اس کے بازو پر تبسم رکھ کے سر سو جاؤں میں
زندگی میں میری آئے کاش وہ لمحہ کبھی

Syeda Tabassum Nadkar
226/1807Road No. 6
Motilal Nagar No. 1
Goregaon West
Mumbai-400104 (MS)

غزلیں

جبیں نازاں

عاشق مری صدی کے سمجھدار ہوگئے
الفت کی رہگزر سے خبردار ہوگئے

*کاذب جو تھے وہ صاحبِ کردار ہوگئے
اور ہم نے سچ کہا تو گنہ گار ہوگئے

قاتل کو شہر یار کا رتبہ عطا کیا
جو شہر یار تھے وہ گرفتار ہوگئے

بچپن میں بھاگتے پھرے جگنو کی چاہ میں
اور اب تو چاند کے ہی طلب گار ہوگئے

اک بار اختلاف ذرا تجھ سے کیا ہوا
جتنے عدو تھے میرے طرفدار ہوگئے

ایسے مریض کا بھی مسیحا علاج کر !
جو دیکھ کر خوشی مری بیمار ہوگئے

بخشے گئے سرور کے لمحے حسیں ہمیں
افسوس! رات دن وہی آزار ہوگئے

جینے کے واسطے تھی ضروری خلش جبیں
دلداراٹھ کے یوں صفِ اغیار ہوگئے

Jabeen Nazan
J23, 2nd Floor, Near Abdullah masjid
Gali.No,12, Ramesh Park,
Laxmi Nagar
New Delhi-110092

فرحانہ نازنین

زندگی کو حادثہ میں زندگی ہی لاتی ہے
دوستی کے رستے سے دشمنی بھی آتی ہے

لب سے کہہ نہ پائے جو آنکھ بول جاتی ہے
خاموشی کے پردے میں بات گنگناتی ہے

ظلم حد سے بڑھ کر جب قہر سب پہ ڈھاتا ہے
چیخ دل فگاراں کی عرش تک ہلاتی ہے

داستان غم اپنی تم کو کب سنا پاتے
چشم نم یہ محفل میں بھید کھول جاتی ہے

تم سے کیا شکایت ہے خود سے ہی گلا مجھ کو
کیوں خیال آتا ہے یاد کیوں ستاتی ہے

وہ خدا ہے تیرا بھی نازنیں نہ غم کرنا
رات ایک آتی ہے جلد ڈھل بھی جاتی ہے

Farhana Nazneen
C/o. Afsar Imam
Apollo Medical Store
C-Block, 17/1, Gali No. 12
Okhla Vihar, Jamia Nagar
New Delhi-110025

غبار

زیبا ناز

آسمان میں کالے گھنے بادلوں کو اڑتا دیکھ کر ناصرہ کا دم گھٹنے لگتا۔اس موسم میں اسے اپنے گھر کے چولہے میں سلگتی لکڑیوں کا دھواں یاد آجاتا۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے انجن کے اس دھوئیں کو جھیلنا اور چولہے کو جھونکنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔جب وہ معصوم سی کلی تھی تبھی سے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے پورے کنبے کے لیے بڑا سا کونڈا بھرا آٹا گوندھ کر روٹیاں بناتی۔روزمرہ کے اس عمل کو مقررہ وقت پر ہوتے دیکھ کر محلے پڑوس کی لڑکیاں چھتوں پر چڑھ آتیں۔جیسے کالی گھٹا کے چھا جانے پر کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے لوگ مکانوں کے بالائی حصے یا سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔دنیا دیکھا کرے! ناصرہ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔جس طرح باغ میں کوک رہی کویل سب کو اپنے نغموں سے لبھاتی اور گاتی ہی رہتی۔کوئی سنے نہ سنے اسے اس سے کیا! اپنے کام سے کام، اپنے چاہنے والوں کو سرور بخشتی۔

ناصرہ کو ابھی روٹی ٹھیک سے بنانی نہیں آئی تھی۔والد صاحب کبھی کبھی چٹکی لیتے ہوئے کہہ دیا کرتے کہ یہ آٹا بناتی نہیں بگاڑتی ہے۔لیکن برا ماننا ناصرہ کی خصلت نہ تھی، بات سچی تھی وہ کبھی ہندوستان کا نقشہ بناتی کبھی پاکستان کا تو کبھی بنگلہ دیش کا۔چولہے کی آگ ایسی جلتی کہ روٹیاں گویا جلتے جنگلوں کا سفر طے کر رہی ہوں، ناصرہ کسی اور ہی جہاں کی۔اس کے مزاج میں ایک قسم کا لاابالی پن تھا،اس لیے گھر کے افراد بھی اس کی روٹیوں پر تنقید نہ کرتے، چپ چاپ کھا لیتے۔پیٹ تو بھرنا ہی تھا دوسرا کوئی یہ کام کرنے والا بھی تو نہ تھا۔ملازمہ کے نخرے دیکھنا کس کے بس کی بات تھی؟

دوپہر اور رات دونوں وقت چولہا سلگانے اور کئی کئی گھنٹے آٹے سے نقشہ سازی کرتے کرتے دھواں ناصرہ کے اندرون میں رچ بس گیا تھا۔وہ سانس باہر چھوڑتی تو دھوئیں کی گندھ آتی، کپڑے اور ہاتھ تو سیاہ ہو ہی جاتے کبھی کبھی منھ بھی کالا ہو جاتا،لیکن اس کا دل بہت صاف وشفاف تھا اور یہ دھواں اس کی سوچ وفکر کو میلا نہ کر سکا۔اس کا طائرِ تخیل اسی دھواں آلود فضا سے اوپر، بہت اونچائیوں پر سفر کرتا اور اُڑانے بھرتا پھرتا۔کیونکہ وہ اس وقت بھی کتاب پڑھتی اور مطالعے میں غرق رہتی۔روزانہ اس کا یہی معمول تھا، وقت کی قلت تھی لہٰذا روحانی آسودگی حاصل کرنے کے لیے وہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دیا کرتی، امتحانات میں بھی یہ عمل بدستور قائم رہتا۔وہ کبھی فیل نہیں ہوئی ہمیشہ کامیابی اس کا مقدر ہوتی۔جب وہ کامیاب ہو جاتی تو گھر کے سبھی لوگوں کے دل میں اس کی عظمت اور زیادہ بڑھ جاتی، والدین

دوسری اولاد کو اس کی مثالیں دیا کرتے اور ترغیب دلاتے۔
کافی دن کی محنت اور ریاضت کے بعد ناصرہ کو روٹیاں گول بنانی آگئی تھیں، اب اس کی روٹیاں جلتی بھی نہیں تھیں، گھر والوں کو اچھی روٹی ملنے کے دن آگئے تھے لیکن اچھے دن آتے ہی رخصت ہوا چاہتے تھے کیونکہ ناصرہ کے بچپن کا پودا اب تناور درخت بننے والا تھا۔ جس میں پھول اور پھل نمودار ہونے کے لیے کھلی فضا اور نمو افزا ہوا کے منتظر تھے۔ یعنی اس کی زندگی کی کتاب کے مزید اوراق پلٹنے تھے۔ لہٰذا ایک شریف النفس پڑھے لکھے اور نفیس نوجوان کے ساتھ ناصرہ کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد اس نے ایک نئی فضا کے ساتھ ایک نیا جہاں دیکھا۔ زندگی کے خوشگوار در وا ہوئے اور اسے مزید نعمتیں میسر آئیں۔

”مکان بیشک آثار قدیمہ کا نمونہ تھا۔ بڑے بڑے عالیشان دروں والا یہ مکان جدید انداز سے سجا بنا سب کی نظروں کو ٹھنڈک اور دل کو تسکین بخشتا۔ کیونکہ یہ عام رواج کے مطابق بنے مکانوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس کے تاریخی در ودیوار اپنے آغوشِ محبت میں پناہ دے کر ایسی سریلی آواز میں لوریاں سناتے کہ ہر ذی روح پر غشی کے بادل چھانے لگتے اور پہروں کے لیے خوابِ غفلت کا شکار بنا دیتے۔ اسی وصف کی بنا پر ناصرہ نے اپنے اس مکان کا نام سوتی بستی رکھ دیا تھا۔ مکین اگر چہ نئی سوچ و فکر کے مالک تھے دقیانوسیت نام کو نہ تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ نیا نہ کر سکے ان کے اعصاب پر اس سوتی بستی کا پورا پورا اثر تھا۔“

مکان قدیم اور بہت پرانے تعمیری طرز کا بنا ہوا تھا، مگر باورچی خانہ جس میں عورت کی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزرتا ہے جدید انداز سے سیٹ کرا لیا تھا۔ لکڑیاں جلانے والا چولہا نہیں تھا۔ یہاں آکر ناصرہ کو صاف شفاف اور تازہ ہوا ملی۔ اس کے اندرون کا دھواں دھواں ہو چلا۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دھوئیں سے پیچھا چھوٹ گیا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی بچپن کی یادیں اور دھواں رچی کتابیں بھی دیگر ساز وسامان کے ساتھ لے آئی تھی۔ کتابوں کے ایک ایک ورق اور ان پر لگے وضع وضع کے دھبے اسے ماضی کی وادیوں کی سیر کراتے اور روحانی سکون پہنچاتے۔ اس لیے وہ اپنی اس کتابی دنیا سے باہر آنے کی بات خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔
مکان بیشک آثار قدیمہ کا نمونہ تھا۔ بڑے بڑے عالیشان دروں والا یہ مکان جدید انداز سے سجا بنا سب کی نظروں کو ٹھنڈک اور دل کو تسکین بخشتا۔ کیونکہ یہ عام رواج کے مطابق بنے مکانوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس کے تاریخی در ودیوار اپنے آغوشِ محبت میں پناہ دے کر ایسی سریلی آواز میں لوریاں سناتے کہ ہر ذی روح پر غشی کے بادل چھانے لگتے اور پہروں کے لیے خوابِ غفلت کا شکار بنا دیتے۔ اسی وصف کی بنا پر ناصرہ نے اپنے اس مکان کا نام سوتی بستی رکھ دیا تھا۔ مکین اگر چہ نئی سوچ وفکر کے مالک تھے دقیانوسیت نام کو نہ تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ نیا نہ کر سکے ان کے اعصاب پر اس سوتی بستی کا پورا پورا اثر تھا۔
وقت کے پرندے کو کوئی قید نہ کر سکا اس کی پرواز پر کوئی قدغن نہ لگا سکا اور اس کی جرأت انگیزی یہ کہ ایک ایک چیز کو چن چن کر عدم آباد پہنچاتا رہا۔ حالات اور ماحول کا روپ بدلنے میں کامیاب ہوتا رہا۔ اس مکان میں آباد خاندان کسی گھنے درخت سے کم نہیں تھا۔ سرد وگرم موسم کے تھپیڑے سالہا سال تک جھیلنے والے پتے آخر کار خزاں کی نظر ہوتے گئے اور ان کی جگہ نئی نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔ ان کونپلوں میں وہ قوت برداشت نہ تھی کہ ہر موسم کی شدت کو سہہ سکیں اور سب کو اپنے مختصر سے دامن میں جگہ دے سکیں، چنانچہ اس گھر کے در و دیوار کی وہ بھینی بھینی محبت آلود خوشبو اور سکون واطمینان کی فضا کی جگہ بے قراری کرب اور اضطراب نے لے لی۔ وہ اگلی سی آسائش و آرائش جو ہوا کرتی تھی ہوا ہوگئی۔

اب ناصرہ کے دیوروں نے بھی شباب کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔ ماں کو ہر وقت اپنے ان دونوں چھوٹے بیٹوں کے گھر آباد کرنے کی فکر لاحق تھی، ان کی دلی خواہش تھی کہ دونوں چھوٹی بہوئیں بھی بڑی بہو جیسی ہی آ جائیں۔ تا کہ گھر کے آنگن میں ان نونہالوں کے ذریعے مسرت کے پھول کھلیں اور ان کی نکہت سے آس پاس کی فضا معطر ہو جائے اور خاندانی جاہ وحشمت اور شان وشوکت قائم رہے۔ لہٰذا اچھی بہوؤں کی تلاش میں دیس پردیس کی خاک چھانی گئی، رشتے دار اپنے پرائے سب کے گھروں میں نظریں دوڑائی گئیں۔ حسنِ اتفاق نزدیک ہی دونوں بہوؤں کا انتخاب ہو گیا۔

ماں کے بڑھاپے کا عالم تھا، اعصاب میں قوت ختم ہو چلی تھی، بہت ہاتھ پیر مارتیں کچھ نہ ہوتا بیٹھی بیٹھی ٹکر ٹکر سب کو دیکھا کرتیں لیکن دماغ سے کام لیتیں بہو بیٹیوں سے کہہ کہہ کر دونوں بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کے انتظامات کرا ہی لیے۔ بڑی بہو نے بیٹھ کر ایک دن گھر کے سب پرانے غلاف اتار پھینکے اور نئے غلاف سی کر چڑھائے، رنگائی پتائی کرا کے گھر کا کباڑہ پھکوایا، فرصت پا کر ساس سے پوچھ پوچھ کر کلیوں والے کرتے سیے۔ پہناوَنی کے جوڑے خرید کر لائی۔ نندوں کے ساتھ جا کر دیورانیوں کے شرارے، غرارے، چوڑی، چوٹی، جوتی، گہنے، دنیا بھر کا سب انتظام اللہ کی رحمت سے دھیرے دھیرے مکمل کر لیا۔ آخر کار وہ دن بھی نزدیک آ گئے جن کا اشتیاق اور انتظار تھا۔ دونوں سمدھیانوں میں متفقہ طور پر یہ بات طے ہوئی کہ ابٹن کی رسم بہت بے ہودہ ہوتی ہے لہٰذا ابٹن نہیں لگائیں گے۔ اپنے اپنے گھروں میں بچے جو چاہیں سو کریں، ایک دوسرے کے گھر نہیں جائیں گے۔ ارمان نکالنے کے اور بہت سے طریقے ہیں۔ حرمت ووقار کی حفاظت بھی تو ضروری ہے لہٰذا شادی سے ایک دن قبل دلہنوں کے جوڑوں کے ساتھ زیب تن ہونے والی ہر چیز مع زینت میں اضافہ کرنے والے سامان کے دونوں دیوروں کی سسرال بھیج دی گئی۔

پہلے دن بڑے دیور کی بارات سجی، دوسرے دن چھوٹے دیور کی۔ ولیمہ دونوں کا ساتھ ہوا۔ مہمان تھے کہ جوق در جوق سیل رواں کی مانند چلے آتے تھے۔ اللہ نے لاج رکھ لی۔ دونوں کے گھر آباد ہو گئے۔ اللہ اللہ خیر سلا! کچھ دن تو یوں ہی چونچلوں اور دعوتوں میں ٹھسّے کے ساتھ گزر گئے۔ جو کچھ رکھا ڈھکا تھا، کچھ دن اس پر عیش کیا لیکن آخر کب تک......؟ گرہستی ہے نانی جی کا گھر نہیں، اپنی اپنی سنبھالنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا ضرورتیں کیسے پوری ہوتی ہیں؟ فکرِ معاش نے دن کا چین اور رات کا قرار چھین لیا۔ ایک نہیں دو دو بیٹوں کا سوال تھا، دونوں نے کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچی۔ شروع شروع میں کبھی کچھ تو کبھی کچھ بارہ مہینے تیرہ روزگار۔ لیکن کسی کام میں کامیابی نہ ملی، کامیابی تو وہ ہیرا ہے جو مسلسل جدوجہد اور سخت مشقت کے بعد بھی نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ خیر محنت کسی کی رائگاں نہیں جاتی۔ چھوٹا تو اپنے چھوٹ پٹ کے کاموں میں لگ گیا۔ اس کا رہن سہن الگ مکان میں تھا، گر پڑ کے وہ تو سنبھل گیا۔ بڑا دیور اسی آبائی مکان میں رہا۔ اس پر سوتی بستی کی غفلت زیادہ چھائی ہوئی تھی۔ فکر مند تو تھا مگر آرام کے ساتھ۔

جب چھوٹا سا تھا تو گھر کے کام دھندوں میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرتا، ساتھ برابر لگا رہتا تھا۔ جبکہ ماں کو اس کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، برتن دھونا یہ تمام کام اس کے شوق کا حصہ ہوا کرتے تھے جو دھیرے دھیرے عادت میں تبدیل ہو گیے اس لے شادی کے بعد بیوی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تو کوئی اعتراض نہ کرتا۔ گھر کے کاموں کی عادت نے اس کے ذہن میں مستقبل کی راہیں روشن کر دیں، ان کاموں میں اسے کامیابی کی مہک آنے لگی۔ ذہن کی اندھیری گپھاؤں میں امیدوں کے چراغ جھلملانے لگے۔ دوستوں اور بہی خواہوں نے ہوٹل کھولنے کی صلاح دی اور کھلوا بھی دیا، جو آپسی ناچاقی اور بدگمانیوں کا شکار ہو کر زیادہ نہ چل سکا جلد ہی اس میں تالے پڑ گئے۔ سب بھائی بہن اپنے اپنے گھر کے ہو چکے تھے سب کی اپنی اپنی دنیا تھی۔ ویسے بھی کون کس کا ہوا ہے؟ مگر ناصرہ بڑی بھاوج............! اس گھر کے نچلے حصے میں رہتی اور دیور اوپر والے عملے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ دونوں کا رہنا سہنا جدا جدا......" لینا ایک نہ دینا دو"۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تعلق تو تھا ہی۔ ماں باپ تو ایک ہی تھے دونوں بھائیوں کے، آنے جانے کا دروازہ بھی ایک ہی تھا۔ جس میں ہمہ وقت چہل پہل رہتی، گھر کے چھوٹے

بڑے ہما شما تو ہر وقت کے تھے اس کے علاوہ ناصرہ کا ڈاکیہ ڈاک لاتا یا دیور کا سالہ یا دونوں کا مشترکہ مہمان، عزیز رشتے دار، دروازے پر خواہ کوئی دستک دے۔ ناصرہ کو ہی دروازہ کھولنا پڑتا۔ کبھی کوئی مجبوری ہوتی مانو نماز کی نیت بندھی ہے، یا آرام میں ہے، تو دروازہ بجتا ہی رہتا جب تک ناصرہ وا نہ کرے، مجال نہیں جو کوئی آنے والے کی خیر خبر لے لے۔ اس بات کو لے کر کبھی کبھی اس کے دل پر میل بھی آجاتا۔ لیکن وہ صبر کا دامن تھامے رہتی۔

”بچپن کا شوق آخر کارگر ثابت ہوا، ناصرہ کا دیور دیکھتے ہی دیکھتے پورا باورچی بن چکا تھا۔ اب تو دروازہ پر لوگ کھانا بنوانے کے لیے آرڈر دینے یا جنس پہنچانے کے علاوہ رکشے میں خالی جھوٹے دیغچے بھی رکھ کر لاتے۔ جن سے ناصرہ کا کوئی سروکار نہ تھا پھر بھی دربان کے فرائض انجام دیتی۔ لیکن حیرانی کی بات یہ کہ جب کوئی رقم لاتا تو دیور جی ہی دروازہ پر آتے نہ جانے انہیں کیسے پتہ چل جاتا۔

بچپن کا شوق آخر کارگر ثابت ہوا، ناصرہ کا دیور دیکھتے ہی دیکھتے پورا باورچی بن چکا تھا۔ اب تو دروازہ پر لوگ کھانا بنوانے کے لیے آرڈر دینے یا جنس پہنچانے کے علاوہ رکشے میں خالی جھوٹے دیغچے بھی رکھ کر لاتے۔ جن سے ناصرہ کا کوئی سروکار نہ تھا پھر بھی دربان کے فرائض انجام دیتی۔ لیکن حیرانی کی بات یہ کہ جب کوئی رقم لاتا تو دیور جی ہی دروازہ پر آتے نہ جانے انھیں کیسے پتہ چل جاتا۔

پہلے تو صرف شادی بیاہ میں ہی باورچیوں کی ضرورت پڑتی تھی لیکن جب سے عورتوں نے اپنے حقوق کو پہچاننا شروع کیا ہے، تب سے اپنے گھر کے کھانے پکانے سے بھی دستبردار نظر آنے لگی ہیں۔ اس لیے تقریباً روز ہی کبھی چھوٹے تو کبھی بڑے آرڈر فون پر تو کبھی بہ نفس نفیس دروازے پر آکر بک ہو جاتے، کھانا دروازے اور صحن میں پک کر لذت سے بھرپور اور خوشبوؤں سے معطر تیار ہو جاتا۔ دیور جی کے ہاتھ میں زبردست ذائقہ تھا جو ایک مرتبہ کھالے انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔

کلو بھائی اپنے وہی پرانے لگے بندھے رکشا والے جو پہلے گھر کے بچوں کو اسکول لانے لے جانے اور خواتین کو بازار، رشتے دار یا شادی بیاہ میں لانے لے جانے کے کام پر مامور تھے۔ لیکن آج دور بدلا، سماج بدلا، رواج بدلا، مزاج بدلے، تقاضے بدلے سب کچھ بدل گیا۔

گھر میں جب بھی کوئی نئی گاڑی آتی کلو بھائی کا منھ ذرا سا ہو جاتا۔ آج سب کے پاس اپنی اپنی سواریاں ہیں لیکن کلو بھائی کے پیٹ کو کسی نے لات مارنا گوارا نہیں کیا، اب وہ دیغچوں کے لانے لے جانے کا کام انجام دیا کرتے اور دیور جی کے جان و مال کو دعائیں دیتے۔ ناصرہ بھابی بے وجہ کام میں لگی رہتیں دیور جی کہیں جا کر کھانا بناتے تو خیر..........! ورنہ وہیں صحن میں باورچہ خانہ سجتے دیر نہیں لگتی۔ باورچی خانے کا کیا عالم ہوتا ہے! کون نہیں جانتا؟ یہاں تو مہا باورچی خانہ بن کر منٹوں میں تیار ہو جاتا۔ دیور جی کی چستی پھرتی قابلِ دید ہوتی۔ کام کے وقت ان کے اندر جنات کی روح سرائیت کر جاتی، آناً فاناً دیغچے لڑھکانا، دھونا یہ تمام کام ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بڑی بڑی نادوں میں گوشت دھونا۔ یہ الگ بات ہے کہ چھیچھڑے پٹھے وہیں پھینک دینا۔ جلدی جلدی چاول دھو کر پانی بہایا جاتا تو کچھ چاول اس آپا دھاپی کی تاب نہ لاتے اور اپنی قوم سے بغاوت پر آمادہ ہو کر دست درازیاں کرتے باہر نکل آتے۔ اور یہ سرکش چاول حشرات الارض کے شکم کا ایندھن بن جاتے اور ان کی افزائشِ نسل کا باعث بنتے۔ نظام قدرت تو دیکھیے دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔

لہسن پیاز چھیلے جاتے تو چھلکے ہوا میں لہرا لہرا کر ناچتے اور اپنی کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے گویا اسے چِڑھانے اور چڑھانے کی مقدور بھر کوششیں کر رہے ہوں۔ لیکن وہ کیوں بھلا بہکاوے میں آنے لگی، ناس جائے ان چھلکوں کا ان کی اوقات ہی کیا ہے؟ زیرا، کالی مرچ، لونگ، چھوٹی بڑی الائچیاں بھی تو ہیں، جنھیں کوٹا جاتا ان کے

وجود کو ختم کیا جاتا لیکن پھر بھی ذہن کو مہکاتی اور فضا کو معطر کرتی رہتیں۔ سب مصالحے تیار ہو جانے کے بعد چولہا روشن ہونے سے پہلے لکڑیاں سلگتیں اور دھواں رہتا، رمتا اور غٹ کے غٹ مکان کے اندر دیوانے ہاتھیوں کی مانند داخل ہوتا۔ جنھیں روکنا آنے والے خیال کی مانند تقریباً ناممکن تھا۔ بند مکان میں یہ ایسے رچ بس جاتے کہ کئی دن تک نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ گھٹی گھٹی فضا ناصرہ کو بچپن کی ان وادیوں میں لے جاتی جن میں اس نے اپنے مستقبل کے بیج بو کر امیدوں کے شجر اگائے تھے اور آج بھی وہ ان سے ثمر حاصل کر رہی ہے۔

''لوگ اس اندیشہ باطل میں غلطاں و پیچاں نظر آتے کہ شایداس گھر میں کوئی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ لیکن یہ وہم اس وقت رفع دفع ہوجاتا جب کلو بھائی کا گھوڑا تیار ہو کر دروازہ پر لگ جاتا اور ساری رونق سمیٹ کر ہوا ہوجاتاجن پر یہ راز آشکار ہو جاتا وہ ہکا بکا رہ جاتے۔''

لیکن ان دیوہیکل ہاتھیوں کی مانند دھوئیں کے غولوں سے تو اسے کوئی ثمر ملنے والا نہیں تھا۔ یہ بادل تو کہیں اور جا کر برسے گا اس کی سیرابی اور شادابی کہیں اور ہی گل کھلائے گی۔ ناصرہ کی سوچ کو یہ تمام باتیں کڑھن میں بدل دیتیں آخر کار وہ اس کڑھن کو نفس امارہ کا داؤ سمجھ کر جھٹک دیتی اور خود کلامی میں محو ہو جاتی اس کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلتا ''ایں روزگار چہار روزہ است''۔

کھانا بن کر تیار ہو جاتا تو بریانی کا بگھار اور مصالحوں کی خوشبو سے نزلے کی طرح کڑھن کی ریزش ہو جاتی۔ اس دوران ہوا سے جو مہک فضا کا حصار کرتی تو ہما شما کے پیر گھر میں نہ پڑتے۔ لوگ اس اندیشہ باطل میں غلطاں و پیچاں نظر آتے کہ شاید اس گھر میں کوئی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ لیکن یہ وہم اس وقت رفع دفع ہو جاتا جب کلو بھائی کا گھوڑا تیار ہو کر دروازہ پر لگ جاتا اور ساری رونق سمیٹ کر ہوا ہو جاتا جن پر یہ راز آشکار ہو جاتا وہ ہکا بکا رہ جاتے۔

اگلے دن جب یہی دیگچے خالی ہو کر واپس دروازہ میں لا کر رکھے جاتے تو پھر آنے جانے والے محتاط نظر آتے کہ شاید اس گھر میں محفل سے فراغت پا کر لوگ آرام کر رہے ہوں، لہٰذا ان کے قدم ٹھٹھک کر رہ جاتے کہ اس وقت جانا مناسب نہیں، پھر کسی اور وقت سہی۔

بسا اوقات ناصرہ کے گھر میں مہمانوں کی موجودگی میں ہی کھانے کے انتظامات شروع ہو جاتے، ظاہر ہے کوئی بھی اس فریب کا شکار بہ آسانی ہو سکتا ہے، لہٰذا وہ اس خوش فہمی میں مبتلا نظر آنے لگتے کہ ان کے لیے یہ اہتمام ہو رہا ہے۔ مہمانوں کے دل میں سکون واطمینان کی لہر دوڑ جاتی، مسرت کی بجلی کوند جاتی ذہن میں پرانے رشتوں ناطوں اور واسطوں کے بادل چھاتے، برستے اور اپنائیت کے پھول مہکتے دیر نہیں لگتی، انھیں اس خوش فہمی کے حصار سے نکالنے کی ذمے داری اہل خانہ کا اولین فریضہ ٹھہرتی۔

اندھیرا چھاتے ہی راتوں رات گھر میں چوہوں کی نصرت ہو جاتی۔ اِن کے نونہال ایک مرتبہ دیگچے میں داخل ہو جاتے تو تنومند ہو کر باہر نکلتے اور رازق کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس شکم سیری کا ذریعہ بننے والے کے جان و مال کو بھی دعائیں دیتے۔ گول مٹول چوہے ادھر ادھر دوڑتے تو ناصرہ کی کتابوں پر فنا کے بادل چھا جاتے۔ اب اس کے اعصاب میں وہ قوت کہاں کہ ان بجلیوں کا مقابلہ کر سکے۔

سر میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے! بڑھاپے کی وادی باہیں پھیلائے اس کی آمد کی منتظر تھی۔ لیکن اپنے بچپن کی ان کتابوں کو آج بھی وہ اسی چاؤ کے ساتھ پڑھتی۔ جن کے اوراق پر چولہے کی کالک اور وضع وضع کے دھبے آج بھی برقرار ہیں۔ ان کتابوں کا ناصرہ کی روٹیوں سے رشتہ آج بھی بہت مضبوط ہے۔ بلکہ انھیں پر زیست کا دارومدار ہے۔

□□□

Dr. Zaiba Naaz
Gokuldas Hindu Girls PG College
Muradabad-244001 (U.P)

افسانے

نازنین فردوس

سنیں دل کی

اٹھیں دانش ۔دانش ۔کب سے جگا رہی ہوں۔آپ اب اٹھ رہے ہیں یا پانی لاؤں۔'' وہ اب غصہ سے کھفرٹر میں دبکے دانش کو ہاتھ سے مکے مارنے لگ پڑی تھی ۔ پے در پے مکوں سے دانش نے کروٹ بدلی۔مگر اٹھا وہ اب بھی نہیں تھا۔

''طوبی ۔پلیز ۔مجھے سونے دو۔تم کیا روز صبح صبح آجاتی ہو۔مجھے میری پیاری نیند سے جگانے۔''اس نے تکیہ اپنے منہ پر رکھ لیا۔

''نا اٹھیں ۔ پڑے رہیں ۔ نیند پیاری ہے مگر صحت نہیں ۔ اس وقت تک لوگ اپنی روزآنہ کی چہل قدمی مکمل کر کے گھر بھی واپس آجاتے ہیں ۔اور آپ ۔۔۔" وہ اب چڑ کر اس سے مایوس ہو کر واپس جانے لگی تھی۔

''کل سے پکا اٹھوں گا نا۔آج آرام کرنے دو پیاری''

''نیند ہی پیاری رکھیں۔ہونہہ۔''

وہ اس پر چادر بھی پھینک چکی تھی۔

اور خود کچن میں چلی گئی تھی۔

طوبی کی شادی ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔اور تین بچوں کے ساتھ وہ ایک خوش گوار کامیاب ازدواجی زندگی گذار رہی تھی ۔ طوبی چاہتی تھی اب دانش اپنی صحت کو سنجیدہ لے اور ڈیلی واک ،ایکسرسائیز وغیرہ کرے تاکہ وہ صحت مند رہے۔

اس کے لیے طوبی اسے روز علی الصباح چہل قدمی کے لیے اٹھاتی تھی۔وہ خود شام میں پارک چلی جاتی تھی۔جبکہ دانش کو مارننگ واک پر جانے کے لیے کہتی تھی۔چونکہ صبح تو اس کے اپنے کام ہوتے تھے جس میں تینوں بچوں کو وقت پر اسکول بھیجنا ٹفن کی تیاری وغیرہ ہوتے تھے۔اس لیے وہ صبح کی چہل قدمی کے بجائے شام کی چہل قدمی کو ترجیح دیتی تھی۔

دانش جب گیارہ بجے تازہ دم ہو کر آیا تو وہ واشنگ مشین میں کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔

''طوبی۔پراٹھے نہیں بنائے۔'' دانش ڈش ہٹاتے ہی بدمزہ ہو گیا۔

''پراٹھے ہفتہ میں دو بار ہی ملیں گے۔آپ پھلکے کھالیں۔''

وہ سفید کپڑوں کو الگ کر رہی تھی۔

''یار۔مجھ سے نہیں کھائیے جاتے یہ پھلکے جس میں نا گھی ہوتا ہے نا نمک''

''نرے سخت ۔ چبائے بھی نہیں جاتے'' وہ اب چاول کی ڈش اٹھا رہا تھا۔

''توبہ ہے دانش۔ایک کھالیں ایسا بھی کیا چٹوراپن، پراٹھے ہوں۔تلا ہوا قیمہ اور مٹن بریانی۔روز روز ایسے ثقیل کھانے معدے پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں۔'' اب وہ مشین لگا چکی تھی اور واپس کچن میں جاتے جاتے بولی۔

''پتا نہیں تمھیں ہو کیا گیا ہے۔اچانک صحت، ورزش، ڈایٹ پلان وغیرہ پر عمل کروانے میں مصروف ہو۔مسئلہ کیا ہے۔لگتا ہے صحت و تندرستی کے چینلز بہت فالو کر رہی ہو۔اب ایسا بھی کیا صحت کو لے کر پریشان ہونا۔'' وہ برا منہ منا کر ابلے چاول ابلی سبزیاں اور سلاد کو دیکھنے لگا تھا۔

''میرے خیال میں چالیس سال کی عمر کے بعد آپ کو صحت کی جانب سے فکر مند ہونا چاہیے۔آپ نے اپنا ماہانہ چیک اپ بھی نہیں کروایا۔کل کا اپائنٹمنٹ لے لوں ڈاکٹر منہاج سے۔'' وہ کچن سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔

''اف۔میرا موڈ نہیں ابھی۔تم تو ایسی باتیں کر کے مجھے سچ مچ کا بیمار بنا دوگی۔کوئی چیک اپ ویک اپ کو نہیں جا رہا میں۔'' اس نے کپ لیا اور برے برے منہ بنا تا چائے پینے لگا۔

''لیکن۔''۔طوبی کچھ بولنا ہی چاہ رہی تھی۔مگر وہ گرم چائے پی بھی چکا تھا۔

''او کے۔خدا حافظ۔دوستوں کے ساتھ پروگرام ہے شاید آنے میں رات ہی ہو جائے۔تم سو جانا۔'' وہ کہتا باہر چلا بھی گیا اور طوبی متفکر سی اپنا چائے کا کپ لیے بیٹھی ہی رہی۔

طوبی، دانش اور بچوں کی صحت کو لے کر بہت متفکر رہتی تھی۔ وہ گھر میں سب کا سخت غذائی جدول بنا چکی تھی اور اسی پر عمل کر رہی تھی۔ اور گھر میں سب کی صحت کا خیال رکھنا اس نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔

لیکن جتنی دانش کی صحت کو لی وہ فکر مند تھی دانش اس بارے میں اتنا ہی لاپرواہ تھا۔

اسے یہ سب وقت کا ضیاع ہی نظر آتا تھا۔

وہ صبح کی چہل قدمی بھی صرف طوبی کی ضد کی وجہ سے کرتا تھا لیکن پابندی اس میں بھی نہیں تھی۔۔اس بات پر طوبی کڑھتی تھی کئی بار اس پر دباؤ بھی ڈالتی تھی کہ وہ اپنی مارننگ واک کبھی نا چھوڑے لیکن دانش کو اس کی ایسی باتیں فضول ہی لگتیں۔اسے لگتا وہ بے کار ہی ہیلتھ کانشس ہو رہی ہے ابھی تو وہ فٹ ہے" اپنی صحت کے حوالے سے وہ کافی پر اعتماد تھا۔

''السلام علیکم آپا۔'' طوبی فون پر راشدہ آپا سے بات کر رہی تھی جو کہ اس کی سب سے بڑی نند تھیں۔اس کی دو اور نندیں دوسرے شہر میں تھیں۔یہ راشدہ آپا ہی اس کے شہر میں تھیں اور اکثر اس کے پاس آتی رہتی تھیں۔

ان کے دو بیٹیاں ایک بیٹا تھا۔بڑی بیٹی کی شادی کو چار سال ہی ہوئے تھے۔انھوں نے اپنی ہی نند کے بیٹے سے بیٹی کی شادی کی تھی۔

''جی۔اورانجم کیسی ہے۔'' وہ اب فرصت میں صوفے پر بیٹھی تھی۔

''اچھی ہے بس ساس جان جلاتی رہتی ہے''

''اوہ۔اچھا۔لیکن ساس تو سگی پھپھو ہی تو ہیں پھر جھگڑا کیسا۔''

''ارے۔سگی پھپھو تو زیادہ جلاد پن دکھاتی ہے۔اب دیکھو جو جو جلن اسے مجھ سے ہے وہ اب میری بیٹی سے ہی نکالے گی نا''۔

آپا کی بات پر اسے ہنسی آئی۔کیونکہ آپا اکثر اس کی اپنی بیٹی کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کئی بار کر چکی تھیں۔

''ہاں۔لیکن سیف تو بہت نرم مزاج ہے ماشاءاللہ۔وہ ضرور انجم کے ساتھ اچھا ہوگا۔''

''ہاں۔وہ تو بہت نرم مزاج ہے۔بس داماد کو دیکھ کر خوش ہوں کہ کم از کم داماد اپنی ماں جیسا نہیں''۔آپا ہنس کر بولیں۔

''ویسے پروین آپا اتنی بری ساس بھی نہیں ہیں۔وہ انجم سے پیار بھی بہت کرتی ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''اب یہ مت پوچھو کیسے پیار کے جھوٹے دعوے کرتی ہے۔کیسے اٹھلا اٹھلا کر بیٹے کے سامنے محبت جتاتی ہے اور بعد میں یوں کرتی ہے جیسے بھتیجی نہیں کوئی دشمن ہے۔یہ مت پوچھو طوبی۔''

اب وہ روایتی جھگڑے سنانے لگی تھیں جو اکثر نندیں اپنی بھابی سے اور وہی اور کم و بیش ویسی باتیں ان کی اپنی بھابھی اپنی نند کے سامنے کر رہی ہوتی تھیں۔۔طوبی بھی ان سب باتوں کا لطف لے رہی تھی۔اسے آپا اور ان کی نند کا بھی پتا تھا۔کچھ باتوں پر لڑتی تھیں تو

پھر کچھ باتوں پر ایسے ہاتھ ملاتیں جیسے کبھی جھگڑا ہی نا ہوا ہو۔
وہ کچن میں تھی جب اطلاعی گھنٹی سنائی دی تھی ۔ باہر آ کر دروازہ کھولا تو آپا کی بیٹی انجم اور اس کے شوہر کھڑے تھے۔
وہ دونوں سلام کرتے اندر آئے تھے۔
''ماموں گھر پر نہیں ہیں کیا'' وہ صوفہ پر بیٹھ گئی تھی۔
''آتے ہوں گے۔سیف بیٹھیں نا آپ۔''
''مامی ایک گلاس پانی پلا دیں ٹھنڈا سا۔'' سیف بھی برابر کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔اس کا زرد چہرہ پسینے سے تر تھا۔اور سانس بھی پھول رہی تھی۔
''ابھی لاتی ہوں''۔وہ جلدی سے اندر جا کر پانی لائیں ۔
''کیسے نکلیں آج۔گڈو کو کہاں چھوڑا۔''
''مامی شاپنگ کے لیے نکلے تھے۔گڈو کو دادی کے پاس چھوڑا۔صبح سے نکلے ہیں تو انھیں تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کی پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا تو سوچا یہاں کچھ دیر رک کر گھر جائیں گے۔پھپھو کا تو پتا ہے۔اگر انھیں پتا چلا کہ شاپنگ میں ہی اتنے گھنٹے لگائے تو بہت ڈانٹیں گی''۔انجم اپنے شاپنگ کے تھیلے نیچے رکھ کر بولی۔
''ہاں ۔ یہ تو ہے۔سیف آپ اندر آرام کرنا چاہیں تو آرام کر لیں۔میں کھانے کا دیکھ آؤں''۔اس نے سیف کی تھکاوٹ کے لحاظ سے کہا۔
''نہیں مامی ۔ ہم بس کچھ دیر ہی رکیں گے ۔بس چائے بنا دیں۔دیر ہوگئی تو پھپھو کا غصہ بڑھتا جائے گا۔'' انجم ہنس کر سیف کو دیکھ کر بولی۔
''اوہ ۔ٹھیک ہے میں چائے لاتی ہوں۔تم دونوں بیٹھو۔''
ابھی وہ اندر جا رہی تھی کہ دانش بھی آفس سے آ گیا۔اور وہ لوگ گپ شپ میں لگے رہے۔ اس نے چائے بنائی اور چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ان کے ساتھ ہی باتوں میں لگی رہی۔
دانش پیسٹری کا دوسرا ٹکڑا اٹھانے لگا تھا کہ اس نے ٹوک دیا۔
''دانش پلیز۔آج آپ کی ڈائیٹ کے حساب سے یہ پیسٹری پہلے ہی زیادہ ہو چکی ہے اور اب دوسرا ٹکڑا۔واپس رکھیں۔'' اس کی بات پر دانش نے شکایتی نظر پہلے اس پر پھر اپنی بھانجی پر ڈالی۔۔

''دیکھ رہی ہو انجم،یہی ظلم ہو رہا ہے روز تمہارے ماموں پر، مہمانوں کے سامنے بھی ٹوک دیا جاتا ہے۔اور کبھی کبھی تو سامنے سے کھانے پینے کی اشیا ہٹا دی جاتی ہیں۔اب تم خود بتاؤ میں کیا اتنا زیادہ فربہ ہوں کہ مجھ پر ایسی پابندیاں لگائی جائیں۔'' سیف نے دہائی دی۔
''مامی ۔ ماموں پر ایسا ظلم کیوں روا رکھ رہی ہیں۔سیف کو دیکھیں ان کی ماں انھیں کیسے صبح صبح اصلی گھی والے پراٹھے، ملائی والی چائے،خوب میٹھا گھی سے بھرا گاجر کا حلوہ کھلاتی ہیں ۔۔میں تو بول کر پچھتاتی ہوں۔آگے سے پھپھو اتنا سناتی ہیں کہ بچے کو کمزور کر دو گی ،صحت بخش کھائے گا تو جان آئے گی۔۔اس طرح کہہ کر ان کا وزن دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔''
انجم اپنے میاں کو دیکھ کر بولی تو دانش کو جینے کا موقع مل گیا۔
''میری ماں نہیں ہے نا۔ میں یتیم ہوں اس لیے میرے ساتھ ایسے ظلم روا رکھے جا رہے ہیں۔۔اسی لیے ماں رہنا چاہیے۔ ورنہ یتیم بچوں کو یوں ہی بھوک سے مار دیا جاتا ہے۔''
دانش نے بڑے قلق سے رونی صورت بنا کر کہا تو انجم سیف اور وہ خود غصہ ہونے کے باوجود ہنس پڑی۔
''بس کریں دانش۔آپ کو تو کچھ کہنا بیکار ہی ہے۔''
''اور انجم ۔سیف کی امی چاہے کتنا ہی غصہ کریں مگر تمھیں سیف کی صحت کو لے کر لاپروا ہی نہیں برتنی چاہیے۔۔'' اس نے انجم کو بھی صحت کے تعلق سے آگاہی دینی چاہی۔
''مامی ابھی تو سیف کی عمر تو ابھی چالیس سال بھی نہیں۔ ابھی سے اتنا ڈائیٹ پلان؟''
''وہ تو ہے کہ ابھی اتنا ضروری نہیں لیکن احتیاط لازمی کرنی چاہیے۔اب پھپھو کو کیا پتا آج کل کے لوگوں کو صحت کے کتنے مسئلے ہو رہے ہیں۔''
سب سے پہلے تو بڑھتا وزن،ہی بیماریوں کو دعوت دینے جیسا ہے۔
اس نے سیف کے وجود پر ایک نظر ڈالی تھی جو دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مامی۔ مجھے واقعی احتیاط کرنی چاہیے۔ابھی آپ کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اچھا خاصہ نڈھال

ہو گیا تھا۔’’سیف نے چائے کی پیالی لبوں سے لگا کر کہا تھا۔
’’ہاں میں نے دیکھا تھا۔ آپ جب آئے تھے تو آپ کی سانس پھول رہی تھی۔‘‘
اس نے بھی تائید کی تھی۔
جب کہ انجم اور دانش نے اس بات کو بہت زیادہ سیریس نہیں لیا تھا۔ وہ ہنسی مذاق میں لگے تھے۔
انجم اور سیف کو گئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک صبح صبح آپا کی کال آئی کہ سیف کی طبعیت ٹھیک نہیں اور اسے ہاسپٹل لے جا رہے ہیں۔
دانش اور وہ اسی وقت نکل گئے تھے لیکن ان کے ہاسپٹل پہنچنے تک سیف کے انتقال کی خبر بھی آ گئی۔
وہ لوگ ہاسپٹل گئے۔ تو وہاں آپا انجم پچھاڑیں مار رو رہی تھیں۔ یہ اتنی اچانک اور ایسی دہلا دینے والی خبر تھی کہ اس کو اور دانش کو سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیسے تسلی دیں کیسے حوصلہ دیں۔ انجم کے دوسرے سسرالی رشتے دار اب ہاسپٹل میں جمع ہونے لگے تھے۔
سب کو اس اچانک موت کا دکھ تھا۔
سیف کو آدھی رات دل کا درد شروع ہوا تھا۔ وہ سینے میں شدید درد کی شکایت کر رہا تھا۔ انجم اور آپا تو بس اس کو درد سے بیڈ پر تڑپتا دیکھ رہی تھیں۔ انھیں کچھ سمجھ بھی نہیں آیا کہ یہ دل کا درد ہے۔ اور ہاسپٹل لے جانے تک وہ زندہ رہا تھا۔ اس کے بعد اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔
اس کی میت گھر لے جائی گئی تھی اور آخری رسومات کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔
وہ آپا کے پاس ہی رک گئی تھی۔ اور انجم کو بس سنبھالنے میں لگی تھی جو اچانک گم صم ٹکر ٹکر سب کو دیکھ رہی تھی۔ گڈو کو دانش باہر لے گیا تھا۔ وہ بالکل سپاٹ چہرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ابھی تو چار سال ہی ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے ملے۔ جانے ابھی کتنے خواب تھے جو ادھورے رہ گئے تھے۔
تین دن تک وہ لوگ وہیں رہے اس کے بعد واپس آ گئے تھے لیکن سب اس دلدوز موت کی وجہ سے خاموش ہو گئے تھے۔
یوں لگ رہا تھا جیسے سیف کے ساتھ وہ سب بھی مر گئے ہوں۔
دن ایک ایک کر کے گذرتے جا رہے تھے۔ اب سب کو صبر آ رہا تھا۔ لیکن سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ اب انجم کا کیا ہو گا۔ اور ایک سالہ گڈو باپ کے بنا کیسے رہے گا۔ انجم اور سیف کی ازدواجی زندگی بہت پرسکون تھی۔ اور کسی بھی جھگڑے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اب اس اچانک موت نے ایک آندھی کی طرح سب کچھ اڑا دیا تھا۔ اب سب کو انجم کے مستقبل کی فکر پڑ چکی تھی۔
آج کی صبح حیران کن تھی کم از کم طوبی کے لیے۔ آج دانش نا صرف جلد اٹھا تھا بلکہ وہ اب اپنے جاگنگ ٹریک سوٹ اور جاگرز پہن کر تیار تھا۔
’’آپ آج میرے جگانے سے پہلے ہی جاگ گئے۔‘‘
وہ متحیر سی اسے دیکھ رہی تھی جو ان چند ماہ میں بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔
’’ہاں۔ وقت پر آنکھ کھل گئی‘‘۔ وہ ایک گہری بات کہتا اب باہر نکل رہا تھا۔
وہ اس کی بات پر غور کرتی اب کچن کی جانب جا رہی تھی۔ اس کو اب بچوں کی روزآنہ کی تیاری کروانی تھی۔
قریب ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ آیا۔
کھانے کی ٹیبل پر بھی اس کا رویہ بہت حیران کر دینے والا تھا۔
اس نے روٹی اور سبزی لی تھی۔
ابلا انڈا اسے سخت ناپسند تھا مگر وہ آج چپ چاپ کھانے لگا تھا۔
ٹیبل پر موجود اچار اور چٹنیوں کو بنا ہاتھ لگائے وہ اپنا کھانا ختم کر چکا تھا۔
وہ انتظار میں تھی کہ شاید اب وہ ان ابلی چیزوں کو تنقید کا نشانہ بنائے۔ مگر وہاں تو سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی۔
اس نے چا‘‘ پکڑائی تو بنا کچھ کہے وہ اب چائے پی رہا تھا۔
پھیکی چائے پر بھی کچھ اعتراض نہیں۔
وہ متعجب تھی۔
’’آپ کو کیا ہوا۔ آپ کی طبعیت تو ٹھیک ہے۔‘‘ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

اس نے چائے کا وہ کپ تپائی پر رکھ دیا۔
''طبیعت تو اچھی ہے الحمدللہ۔لیکن طوبی آنکھیں ضرور کھل گئی ہیں۔وقت پر۔''
وہ بدستور سنجیدہ تھا۔
''آپ نے صبح بھی یہی کہا تھا اس بات کا کیا مطلب کہ آنکھیں وقت پر کھل گئیں۔ایسا کیا تبدیل ہو گیا آپ کے اندر''۔وہ جو اس کے بدلتے رویہ اور سنجیدہ سے انداز کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ اب پوچھ بیٹھی۔
''طوبی۔جب سے سیف کی ڈیتھ ہوئی ہے تب سے ایک فکر ہے جو ہر پل ہر لمحہ مجھے جکڑ لیتی ہے۔کہ اسے کچھ الرٹ رہنا چاہیے تھا۔وہ سمجھ کیوں نہیں پایا کہ دل کی تکلیف کا،کاش وہ چیک پ کے لیے چلا جاتا،شاید اس کے دل کے عارضے کا پتہ لگ جاتا۔شاید وقت پر اس کا علاج ہو جاتا،کاش وہ کچھ پرہیز کرتا،کاش وہ روز واک کو جاتا تب شاید اس کی بیماری پکڑ میں آجاتی۔
کاش۔۔کاش۔۔۔کاش
بس یہ ساری باتیں ہیں جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ کاش وہ اس طرح کرتا تو شاید انجم اور اس کا بچہ یوں باپ سے محروم نا ہوتے''۔
بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔انجم اپنی ماں کی پہلی اولاد تھی اس لیے وہ ننھیال میں سب کی لاڈلی تھی۔دانش بھی اسے اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔
اور اتنی کم عمری میں اسے یوں بیوگی کی چادر اوڑھے دیکھنا کسی امتحان سے کم نا تھا۔۔
طوبی بھی اس کی کیفیات کو سمجھ کر خاموش رہی تھی۔
پھر کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ گویا ہوئی۔
''دانش۔ میں آپ کو یہی بات سمجھانا چاہ رہی تھی۔جو آپ ایک برے تجربے سے سیکھ چکے ہیں۔آپ خود سوچیں آج ہم انجم اور انجم کے بچے کو لے کر کتنے متفکر ہیں۔موت صرف ایک انسان کی نہیں ہوتی۔موت اپنا اثر پوری فیملی پر چھوڑتی ہے۔صرف ایک تنہا فرد کی موت سارے گھر کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔
اور سارے گھر کو اس موت کے بعد پیش آنے والے سنگین نتائج کو بھگتنے پڑتے ہیں۔
اگر اس قسم کی کم عمری میں موت ہو تو ایسے والدین کے بچے کس احساس محرومی کے سائے تلے پلتے بڑھتے ہیں اس کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔
ماں یا باپ کی عدم موجودگی بچوں کے دل و دماغ کو کس حد تک متاثر کرتی ہے وہ ہم کبھی اندازہ بھی نہیں کر پاتے۔
ساری دنیا بھی مل کر اس ایک ماں اور باپ کی کمی پوری نہیں کر سکتی۔بس یہی المیہ ہے۔
اس لیے میں چاہتی تھی کہ ہم وقت کے ساتھ کچھ الرٹ ہو جائیں۔اس دل کی سنیں جو وہ سنانا چاہتا ہے۔
اگر آپ چلتے ہوئے ہانپ رہے ہیں۔آپ کو گھبراہٹ،بے چینی ہو رہی ہے۔اگر آپ کو ٹھنڈے پسینے آرہے ہیں تو آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس چلے جائیں۔
آپ بلڈ پریشر چیک کرواتے رہیں۔یہ آپ کا دل ہر وقت آپ کو کچھ کہتا رہتا ہے۔اسے سمجھیں۔وہ اگر تیز دھڑک رہا ہے تو اس کی وجہ کو کھوجیں۔
اگر آپ کی دھڑکن سست لگ رہی ہے تب بھی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔آپ کو خود وہ وجہ ڈھونڈنی ہوگی۔آپ کا دل آپ کو کچھ اشارے ضرور دیتا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔آپ کو ان اشاروں کو سمجھنا اور اس کے علاج کی فکر کرنا ضروری ہے۔
اور اس سب سے پہلے اگر آپ روز آنہ واک کو معمول بنائیں، سادی غذا کھائیں،نمک مرچ شکر کنٹرول میں کھائیں تو آپ کی صحت میں توازن ہوگا۔
ایسی ہی کئی چھوٹی چھوٹی عادتیں اپنی روٹین میں شامل کریں گے تو بہت سی ناگہانی آفت سے بچ سکتے ہیں۔''طوبی کی من کی مراد بر آئی تھی۔وہ کئی دن سے چاہ رہی تھی کہ اس موضوع پر بات ہو مگر دانش کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا تھا۔لیکن سیف کی اچانک موت سے اس میں بے حد تبدیلیاں آئی تھیں۔
''ہمم۔تم جو بتانا چاہ رہی تھیں اور تم جس بات کو لے کر

تشویش میں مبتلا تھیں اس کا ادراک اب ہوا ہے۔کتنا آسان ہے یوں کہنا کہ یہ پرہیز و رہیز مجھ سے نہیں ہوتا۔ مارننگ واک کے لیے اٹھا نہیں جاتا۔لیکن جب اپنے معصوم بچوں کا سوچتا ہوں تو کلیجہ ہی منہ کو آرہا کہ اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بچے اس ظالم دنیا کو کیسے جھیلیں گے۔''

''آپ کو وقت پر خیال آ گیا یہ کافی ہے میرے لیے۔آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ڈائیٹ کنٹرول کریں۔ماہانہ چیک آپ کر وائیں ۔اتنا کافی ہے میرے لیے۔میرے بچوں کے لیے۔'' آخر میں وہ جذباتی ہوئے تھی۔

دانش کی بھی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''ویسے۔انجم کی عدت کے دن ختم ہوتے ہی آپا اس کے لیے رشتہ ڈھونڈیں گی تاکہ جتنا جلد ہو سکے اس کی دوسری شادی ہو جائے۔اگر کوئی اسے بچے کے ساتھ قبول کرے تو پھر کوئی فکرمندی کی بات نہیں ہوگی''۔طوبی اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

''ہاں۔اللہ کرے۔وہ ایک نئی زندگی کی جانب پلٹے۔ایک خوش گوار مستقبل اس کا منتظر ہو۔دانش اب بھی جذباتی تھا۔

''آمین''۔طوبی دانش کی بات پر آمین کہتی اٹھی تھی۔

❑❑❑

Naazneen Firdose
H-no-8-15-70/3/1
Mohammedia colony
Vattepally,
Hyderabad 500053 (Telangana)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

ارتباط

محبّی ،سلام مسنون۔

’خواتین دنیا‘ برائے مارچ 2025 وصول ہوا۔طویل عارضے کے سبب آپ کی بزم سے غیر حاضر رہنا پڑا۔اس شمارہ کے سرورق پر 8 مارچ برائے عالمی یوم خواتین نمایاں ہے اور اداریے میں اسے مزید اجاگر کیا گیا ہے یعنی اوّل تو اس کے آغاز سے اب تک کی دلنشین تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے دوران کچھ سیاسی ہل چل کا بھی ذکر ہے۔ یہی نہیں اردو ادب میں خواتین کو گھنے درخت کی جڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بھی وضاحت ہے کہ اُردو شعری ونثر کے سرمائے میں بھی ان کے رنگ نظر آتے ہیں۔ بلکہ میر، سودا، غالب، مومن، ذوق، انشاء، مصحفی، آتش، ناسخ تک کے کلام میں وجودِ زن کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ اگر اس رنگ کو بعد کے مزید ادبا وشعرا تک وسعت دی جاتی تو یہ رنگ مزید رنگین ہوجاتا۔ اداریے کا یہ بیان کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ نئی شعری روایت میں عورت کے حقوق اور تحفظ کے مسائل کو نہایت ادب واحترام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مشعل کے بعد اس شمارہ کو چھ اصنافِ سخن میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے تحت کوئی 19 ذیلی سرخیاں درج ہیں جنھیں تقریباً استادانِ ادب نے پیش کیا ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ اِن 19 ادبا میں 17 خواتین ہیں اور مرد صرف دو ہیں۔

’شخصیات‘ کے ذیل میں پہلا مضمون ڈاکٹر ظفر الاسلام نے پیش کیا ہے۔’ہیلن کیلر‘ جو مصنف کی نظر میں ’ایک محرک اور امید افزا شخصیت ہے‘۔اس مضمون کی سنجیدہ اور خاص بات یہ ہے کہ معذوری کامیابی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں اور یہ کہ انسان کی اصل طاقت

اس کا عزم اور حوصلہ ہے۔ مثلاً تھامس الوا ایڈیسن سماعت سے محروم تھے مگر انھوں نے کئی چیزیں ایجاد کیں، مثلاً بلب۔ ویسے ہی اسٹیفن ہاکنگ جو تمام عمر وہیل چیئر پر رہے۔ نیل ارنسٹ اپنی ٹانگ گنوا بیٹھے تھے پر اولمپک میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ لوئی بریل بصارت سے محروم تھے مگر انھوں نے بریل رسم الخط ایجاد کیا۔ اسی فہرست میں ہیلن کیلر کا بھی نام آتا ہے جو بینائی، سماعت اور گویائی سے محروم تھیں۔ اس کے باوجود تعلیم حاصل کی، کئی کتابیں لکھیں اور زندگی بھر سماجی خدمات انجام دیتی رہیں۔ بڑا سبق آموز مضمون ہے۔ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔

دوسرا مضمون بعنوان 'نشاط النساء بیگم۔تحریک آزادی کی علمبردار' ڈاکٹر رضیہ سلطانہ بیگم کا تحریر کردہ ہے۔ نشاط النساء بیگم حسرت موہانی کی زوجہ تھیں اور یہ دونوں ہی شخصیتیں تحریک آزادی میں نہایت نمایاں تھیں۔ مضمون کو تحقیقی مناسبت سے قلمبند کیا گیا ہے جس کی وجہ سے موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا۔ زبان و بیان نہایت شستہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو زبان و بیان پر نہایت قدرت حاصل ہے۔ لیکن ایک خیال اس سلسلے میں یہ گزرتا ہے کہ ایسے مضامین عموماً ادبی رسائل بلکہ عاجلانہ ادب میں بھی جگہ پاتے ہیں اور عوام ان واقعات سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ محترمہ محسنہ نگار صاحبہ نے 'ابن کنول' کے افسانوں میں داستانوی اثرات کی کھوج کی ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے قدیم کلاسیکی ادب کی اہمیت و افادیت سے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ مضمون تحقیقی نوعیت رکھتا ہے اور غیر ضروری اور شخصی تفصیلات سے یکسر مبرا ہے اور تمام تر اُن کے فن پر ہی توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہ مضمون بتاتا ہے کہ تحقیقی مضمون کیسے مرتب کیا جاتا ہے۔ محترمہ شمیم صاحبہ نے 'بوسۂ نم' کے حوالے سے لطف الرحمن کے 'رنگ تغزل' کا جائزہ لیا ہے۔ 'بوسۂ نم' دراصل لطف الرحمن کے غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں شاعر نے حمدیہ اور نعتیہ شاعری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت قائم کی ہے اور مصنفہ نے اس جانب نہایت باریک اشارہ کیا ہے۔ مضمون کو جابجا بروقت اشعار اور مناسب اقتباسات کی مدد سے نہایت عمدگی سے سنوارا ہے۔ واضح ہو کہ اس مضمون کا جائزہ اکیسویں صدی کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ پانچواں اور اس سلسلہ کا آخری مضمون محترمہ شبانہ عشرت کا تحریر کردہ ہے۔ عنوان ہے 'قاسم خورشید۔قلم و ادب کے خورشید تاباں'۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ فن پر لکھنے کے لیے فنکار کے ظاہر و باطن کی تفہیم ایک کارِ دارد ہے کیوں کہ بعض رموز کی ستاری کے لیے نقاب کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔ اس کی یہی ایک صورت ہوسکتی ہے کہ لاشعور کو ٹٹول کر صحیح (یا غلط) اندازے قائم کیے جائیں۔ بہرحال اس مضمون کا بیشتر انحصار قاسم خورشید کی لکھی ہوئی کئی کتابوں پر قائم ہے۔ ان کے علاوہ کہانیاں، ڈرامے، افسانوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ بہرحال معلوماتی مضمون ہے ضرور مطالعہ کریں۔

'جہانِ نسواں' میں چار مضامین درج ہیں۔ ان میں پہلا مضمون ڈاکٹر رابعہ ناز کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'تانیثیت کا ایک پہلو عالمی یوم خواتین'۔ اس کی ابتدا میں تاریخ درج ہے جو بڑی دلچسپ ہے لیکن بعد میں اس میں کئی تضاد ظاہر ہوتے ہیں۔ پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اس سلسلے کا دوسرا مضمون بعنوان 'کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور خواتین' جناب عادل حسین بھٹ کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیر کی ثقافت میں خواتین کی فعالیت کی ایک طویل اور نمایاں روایت رہی ہے اور کہ انہیں مختلف سماجی شعبوں میں بے شمار مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ اگر آپ کو عہد قدیم اور عہد وسطیٰ میں دلچسپی ہو تو اس مضمون کا ضرور مطالعہ کیجیے۔ ڈاکٹر روحی خان نے 'اُردو ادب اور جموں و کشمیر کی خواتین' تحریر کیا ہے۔ اس میں پہلے پہل ہمارے سماج میں خواتین کی اہمیت کا ذکر ہے جو ایک حقیقت ہے۔ یعنی کشمیر میں اُردو کی پہلی غزل گو شاعرہ زینب بی بی محبوب ہیں جن کا نعتیہ کلام بعنوان 'گلبن نعت' معروف ہے۔ ان کے بعد شہزادی کلثوم کا نام آتا ہے۔ انھوں نے نظم کے علاوہ نثری تحریریں بھی لکھی ہیں۔ ان کے بعد ترنم ریاض، شبنم عشائی بھی قابل ذکر ہیں۔ پھر مختلف شاعرات کے کلام سے اس مقالہ کو مزید رفعت دی گئی ہے۔ معلومات سے بھرپور اچھا مضمون ہے۔ محترمہ فرحین خانم نے 'اُردو ادب میں خودنوشت' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اُردو کی پہلی خودنوشت جعفر تھانیسر کی 'تواریخ عجیب' (کالا پانی) سمجھی جاتی ہے جو جنگِ آزادی کے دوران 1885 میں لکھی گئی تھی۔ مزید یہ کہ شورشِ

دوران حمیدہ سالم کی مشہور آپ بیتی ہے۔ پھر عصمت چغتائی کا 'کاغذی ہے پیرہن'، الاختر الایمان کی 'اس آباد خرابے میں' وغیرہ خود نوشتیں کافی مشہور ہوئیں۔ ابھی اور بھی تفصیلات اس مقالہ میں دی گئی ہیں جنھیں پڑھ کر ادبی ذوق کی تسکین کی جاسکتی ہے۔ 'حسن سخن' میں ایک غزل اور تین نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر قدسیہ انجم نے اپنی غزل کے پانچویں شعر میں قافیہ 'سوکھی' باندھا ہے۔ یہاں ذرا غور کر لیتیں تو اچھا تھا۔ باقی نظمیں گوارا ہیں۔ 'افسانے' کے ذیل میں دو افسانے درج ہیں۔ غنیمت ہیں۔ 'صحت' کے ذیل میں خواتین کے تناظر میں حفظانِ صحت ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین نے تحریر کیا ہے جسے کہیں کہیں ادبی ٹچ دیا گیا ہے۔ ویسے خواتین کے لیے ایک اچھی کوشش ہے۔ 'ارتباط' میں تین عمدہ مکاتیب ہیں۔ متذکرہ بالا تفصیلات سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ اس شمارہ کے جلو میں کوئی دوسرا جریدہ یہ مزہ بہم نہ پہنچا سکے گا۔ مومن

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، چھترپتی سنبھاجی نگر، (مہاراشٹرا)

ماہنامہ خواتین دنیا مارچ 2025 موصول ہوا۔ سرورق پر نظر ٹھہری رنگوں کا انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ سرورق سادگی سے پر اور آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والا معلوم ہوتا ہے۔ 8 مارچ کا دن بین الاقوامی یوم خواتین کے روپ میں منایا جاتا ہے۔ شمارہ کے سرورق سے ہی اندازہ ہوتا ہے یہ شمارہ خصوصی طور پر یوم خواتین کے موقع پر تحریر کردہ مضامین کے مجموعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اداریہ پورے شمارے کا نچوڑ ہوتا ہے اداریہ پڑھ کر رسالے کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مدیر اعلیٰ ڈاکٹر شمس اقبال صاحب کا تحریر کردہ 'مشعل' کے عنوان سے اداریہ ان کے دیگر اداریوں کی مانند فکر انگیز ہے۔

شمارے میں کل 9 مضامین شامل ہیں۔ شخصیات کے ذیل میں پانچ مضامین ہیں جن میں پہلا ڈاکٹر ظفر السلام کا 'ہیلن کیلر: ایک محرک اور امید افزا شخصیت' ہے جس میں ہیلن کیلر کی زندگی اور ان کی شخصیت کے حوالے سے استعاراتی انداز میں یہ واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ جسمانی طور پر معذور افراد چاہیں تو اپنی محنت، لگن، صلاحیت، اور بلند حوصلے کے سبب معذوری، ان کی کامیابی کی راہ میں روکاوٹ نہیں بن سکتی۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر رضیہ سلطانہ کا حسرت موہانی کی شریک حیات نشاط النساء بیگم کی زندگی اور تحریک آزادی میں ان کی سیاسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ نشاط النساء بیگم کا کردار خواتین کے لیے ایک مثال ہے۔ محسنہ نگار نے 'ابن کنول کے افسانوں میں داستانوی اثرات' کے تحت ابن کنول کے ادبی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے افسانوں میں داستانوں کے اثرات کو نمایا کرنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ صبیحہ شمیم نے 'لطف الرحمان کا رنگ تغزل 'بوسہ نم' کے حوالے سے' ان کی غزلوں میں تغزل کے مختلف رنگوں کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ محترمہ شبانہ عشرت کا مضمون 'قاسم خورشید قلم وادب کے خورشید تاباں' میں موضوع کے تحت موصوف کی زندگی اور ان کے ادبی سفر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

'جہاں نسواں' کے تحت چار مضامین شامل ہیں جو کہ قابل مطالعہ ہیں۔ 'تانیثیت کا ایک پہلو: عالمی یوم خواتین' میں خواتین کے حقوق کے لیے کی گئی جدوجہد اور تحریکات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ 'کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور خواتین'، اردو ادب اور جموں و کشمیر کی خواتین'، 'اردو ادب میں خود نوشت' جیسے موضوعات کے تحت لکھے گئے مضامین بھی عمدہ اور معلوماتی نوعیت کے ہیں۔

''حسن سخن'' کے ذیل میں شاعرات کے منتخب، اثر انگیز، اور دلچسپ کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ حصہ دور حاضر کے کرب اور انتشار کا آئینہ دار ہے۔ افسانے کا حصہ بھی قابل ذکر ہے اور افسانے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ گوشۂ صحت کے تحت ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین کا مضمون ''حفظان صحت: خواتین کے تناظر میں'' خواتین کے حقوق اور ان کی صحت کے مد نظر حکومت کی جانب سے جو اسکیمیں بنائی گئی ہیں ان کی عام خواتین کو معلومات نہیں ہو پاتی مصنفہ نے ان اسکیموں کی جانب اشارہ کیا ہے اس کا مطالعہ خواتین کے علم میں اضافے کا سبب بنے گا۔

ثنا، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بریلی کالج، بریلی۔ اتر پردیش

❑❑❑

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قیام امن: ایک جستجو

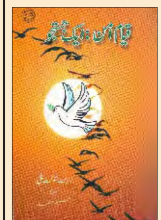

مصنف: زینت شوکت علی، مترجم: نسیم احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 586+xxii

قیمت: 310 روپے

پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں

مصنف: کمل کشور گوئنکا، مترجم: محمد صغیر حسین

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 283

قیمت: 165 روپے

سوانح عمری: حاجی محمد سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی

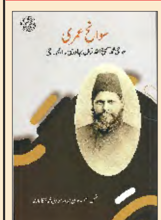

مصنف: شمس العلما خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 172+xii (حصہ اوّل)، 72+5 (دوم)

قیمت: 160 روپے

تنویر احمد علوی (مونوگراف)

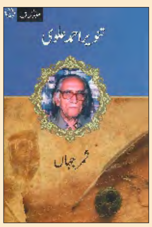

مصنف: ثمر جہاں

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 170

قیمت: 120 روپے

انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم

مولف: انس مسرور انصاری

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 100

قیمت: 35 روپے

حالی کا سیاسی شعور

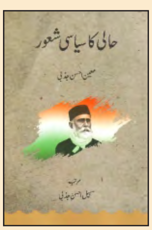

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

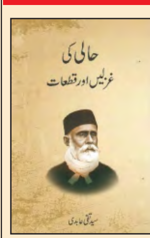

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

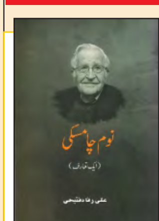

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक ,मई-२०२५वर्ष:९ , अंक: ५
Mahnama Khawateen Duniya Monthly May 2025, Vol.9, Issue: 5
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-05-2025
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

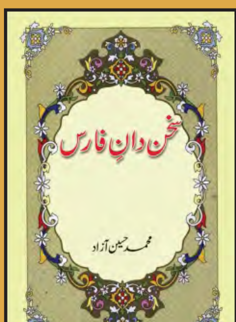

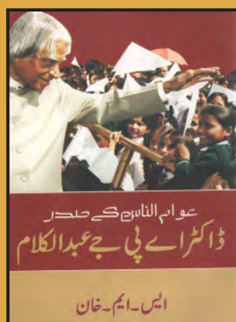

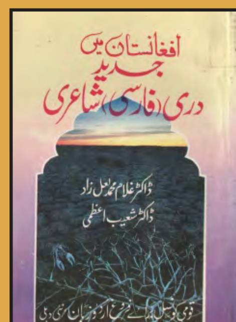

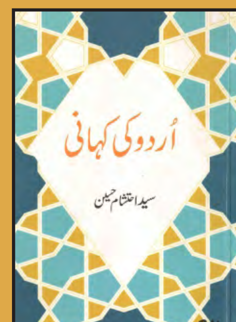

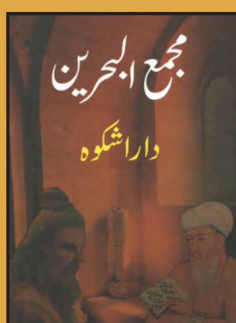

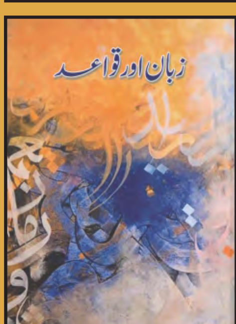

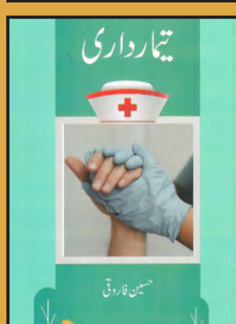

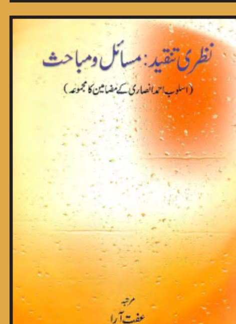

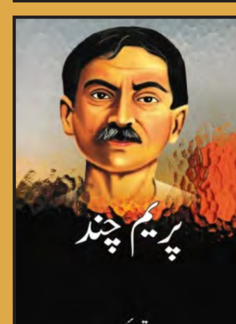

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025